Regd No. LW/NP 56
Phone 22345 / 29747

TAMEER-E-HAYAT

Fortnightly
(NADWATUL-ULAMA LUCKNOW-226007 (INDIA)

مجمع بحار الانوار
(احادیث کی مشکلات حل کرنے کے لئے بے نظیر کتاب)

تالیف: ملک المحدثین علامہ شیخ محمد طاہر پٹنی گجراتی

ہندوستان میں
مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ
سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

جعلی لیبل، نقلی کیپسول اور ڈبے کے ڈھکن سے ہوشیار!
نورانی تیل
درد - زخم - چوٹ - جلنے - کٹنے کی دوا -
اب سنہرے اور ہرے دو رنگے کیپسول پر ٹریڈ مارک دیکھ کر خریدیئے۔
انڈین کیمیکل کمپنی

ہند تیل
تیار کردہ: ہند سی جی ورکس

تعمیرِ حیات
میں
اشتہار دیکر
اپنی تجارت
کو
فروغ دیجئے

شربت نزلہ
معمولی کھانسی، زکام اور نزلہ کے لئے
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عطر مجموعہ نمبر ۳۹۱۸
حافظ محمد زکریا برادران تاجران عطر و تیل

بہترین چائے کا قابل اعتماد مرکز
عبّاس علاء الدّین اینڈ کمپنی
TELEGRAM: CUP, KATTLY
PHONE No 332220

اسپشل مکسچر	کپ برانڈ
اسپشل ممری	گولڈن ڈسٹ
نوبل مکسچر	فلاور بی او پی

تعمیرِ حیات

لکھنؤ

پندرہ روزہ

سنگین اقدام

تاریخ جدید کا شاید سب سے بڑا سانحہ اور سیاست کی انسانیت کے حق میں سب سے بڑی زیادتی یہ ہے کہ ذہن و اخلاق کے سرچشمے، شخصیت و کردار کی کارگاہیں، اور زندگی کی رہنمائی کرنے والے مرکز، بے رحم اور بے ضمیر سیاسی مقاصد، اور انتخابی مصالح کے تابع ہو جائیں، اور وہ ان کے مستقبل، اور ان کی موت و حیات کے بارے میں فیصلہ کن بن جائیں۔ اس اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ قومی حکومت، غیر ملکی حکومت کے مقابلہ میں قومی زندگی اور تعلیم و تربیت کے میدان میں رہنمائی کی زیادہ قابل اور اعتماد کی زیادہ مستحق ہے، اور اب حکومتوں کا دائرہ اختیار ٹیکس وصول کرنے اور جان و مال کی حفاظت اور ملک کی دفاع تک محدود نہیں، میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ تعلیمی مرکزوں کو صنعتی کارخانوں، فیکٹریوں، اور ملوں پر قیاس کرنا اور ان کو یکسر اپنے نظم و نسق میں لے لینا، ان کا رشتہ اس اقلیت، فرقہ یا جماعت سے کاٹ دینا، جس نے ان کو قائم کیا، اور اپنے خون پسینہ سے ان کو پروان چڑھایا، ایک بڑا سنگین اقدام ہے جس کے نتائج بڑے دور رس اور عمیق ہیں، کسی ملک میں ایک ہی طرح کے دل و دماغ کے ڈھالنے، ایک ہی طرح کی سیرتیں اور شخصیتیں پیدا کرنے اور ایک ہی طرح کے سیاسی خیالات و مقاصد رکھنے والوں کا گروہ وجود میں لانے کی کوشش، ملک اور معاشرہ کو ایک بڑے خطرہ سے دوچار کرنے کے مرادف ہے، یہ رویہ کسی شو فیکٹری اور کسی گن فیکٹری کے ساتھ تو مناسب ہے، لیکن دانشگاہوں، اور ذہنی تربیت کے مرکزوں کے ساتھ کسی طرح مناسب نہیں۔

تاریخ کی مسلسل شہادتیں ہیں کہ جب کسی وجہ سے کسی ملک اور معاشرہ پر کسی غلط فلسفہ یا رجحان کا تسلّط ہوا اور وہ کسی بے راہ روی، بے اعتدالی یا کسی شدید اخلاقی، ذہنی اور اجتماعی انتشار کا شکار ہوا تو صرف دو مرکزوں سے اس کی چارہ سازی کا انتظام ہوا۔ یہ مذہب اور تعلیم کے دو مرکز ہیں۔

(مولانا سید ابو الحسن علی ندوی)

زرِ اشتراک اندرونِ ہند مع محصول ڈاک:
سالانہ: ۱۲ روپے ششماہی سات روپے
فی پرچہ: ۶۰ پیسے
بیرونِ ہند مع محصول ڈاک:
بحری ڈاک سے: ایک پاؤنڈ شلنگ
ہوائی ڈاک سے: امریکہ کے لئے ڈالر
یورپین ممالک: ۳ پونڈ
افریقہ، مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید کے ممالک ۲½ پونڈ
پاکستان: ۳۰ روپے
بنگلہ دیش: ۱۵ روپے

تعمیرِ حیات

لکھنؤ

پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر ۱۴ | ۲۵ مئی ۱۹۷۷ء — ۶ جمادی الثانی ۱۳۹۷ھ | شمارہ نمبر ۱۴

اسحٰق جلیس ندوی

حلقۂ پیامِ انسانیت کا کل ہند کنونشن

یوم جمعہ ۲۹ اپریل ۱۹۷۷ء کو دائرہ شاہ علم اللہؒ رائے بریلی میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایماء سے یہ طے کیا گیا کہ حلقۂ پیام انسانیت کا کنونشن بلایا جائے، حضرت مولانا کا امریکہ کا سفر ماہ مئی کے آخری عشرے میں متوقع تھا لہٰذا کنونشن کا انعقاد اس سفر سے پہلے ضروری تھا۔ ۲۰، ۲۱، ۲۲ مئی ۱۹۷۷ء کی تاریخیں طے ہوئیں، رائے بریلی سے لکھنؤ پہونچے تو یکم ماہ مئی شروع ہو چکی تھی گویا کنونشن کے تمام انتظامات دعوت ناموں کی ترسیل، خط و کتابت سہ روزہ پروگرام کی تفصیلات غرض تمام کاموں کے لئے صرف دو ہفتے کا وقت تھا۔ اس مختصر مدت میں کل ہند کنونشن بلانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

ان ہی ایام میں ملک کی دس ریاستوں کی اسمبلیوں کے انتخابات کا اعلان ہو گیا تین سال بعد مرکزی قیادت میں تبدیلی کے بعد ریاستی سطح پر یہ پہلے انتخابات ملک کی سیاسی اور ہنگامہ پسند فضا میں ہر شخص کی توجہ کا مرکز بن گئے، اس ماحول میں کسی سنجیدہ موضوع، ٹھوس کام اور انسانیت کی بے لوث خدمت کی دعوت اجنبی بن کر رہ جائے تو تعجب کی بات نہیں۔

موسم گرما کے شباب کا آغاز، تعلیمی اداروں میں سالانہ تعطیل کی وجہ سے ٹرینوں اور بسوں میں بے پناہ ہجوم، غرض ہر بات کسی ایسے اجلاس کو بلانے میں مانع تھی جس میں ملک کے دور و قریب کے علاقوں سے نمائندگی ہونا تھی — ان تمام نامساعد حالات کے علم و اندازہ کے باوجود حلقہ پیام انسانیت کا کنونشن مقررہ تاریخوں میں ہوا اور خدا کے فضل و کرم سے ہر اعتبار سے کامیاب رہا۔

اس کنونشن نے تحریک پیام انسانیت میں نئی روح پھونک دی، اس تحریک کے مستقل دفتر کا قیام، تعارفی لٹریچر کی مختلف زبانوں میں طباعت، اس کام سے دلچسپی رکھنے والے ملک کے مختلف علاقوں کے رفقاء سے رابطہ، برادرانِ وطن تک اپنی دعوت و پیام پہونچانے کا سنہرا موقع اس کنونشن نے فراہم کر دیا۔ اس کنونشن کے ذریعہ ایک نامانوس صدا سے ہزاروں کان آشنا ہوئے، لوگوں نے اپنی دلچسپی اور ہر ممکن تعاون کا حیرت انگیز مظاہرہ کیا۔ کنونشن کے بعد پورے ملک سے جو خطوط آ رہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسانی سماج ابھی زندہ ہے، اس میں ایسے ہزاروں افراد ہیں جو اپنے مقام و مقصدِ حیات سے آشنا اور احترامِ آدمیت کی اہمیت و ضرورت سے آگاہ ہیں۔ تحریک پیام انسانیت نے اپنے اغراض و مقاصد اور طریقۂ کار میں ایسے حساس لیکن خاموش انسانوں کو قوتِ گویائی اور دردمند دلوں کو دھڑکن بخشی ہے۔

تحریکِ ندوۃ العلماء کا اپنے یوم تاسیس سے سے

تو برائے وصل کردن آمدی ❊ نے برائے فصل کردن آمدی

طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اسی تعلیمی تحریک کے قائم کردہ دار العلوم کی چہار دیواری میں حلقۂ پیام انسانیت کا کنونشن موجودہ ہندوستان میں وصل کی ان بنیادوں کو مستحکم کر رہا تھا جو اس ملک کی ہزار سالہ ضرورت تھی۔ ہم اس ملک میں تاریخ کے ایسے دور میں آئے اور رب العالمین کی مشیت سے بھیجے گئے جب یہاں کا انسان ذات پات، عدم مساوات، سماجی اور معاشی استحصال، اور غلط رسوم و رواج کی بیڑیوں میں جکڑا کسی نجات دہندہ کا منتظر تھا، اسکی جاں بلب حالت کسی ایسے مسیحا کی منتظر تھی جو اسے نئی زندگی بخشے، مریض انسانیت کی چارہ سازی کا سامان اور شفاخانۂ نبوی کے کیمیا اثر نسخوں کو لیکر ہمارا کارواں رود گنگا کے کنارے اترا تھا لیکن اس ملک میں ہماری ہزار سالہ تاریخ اپنے اصل مقصد و مشن سے افسوسناک غفلت کی تاریخ ہے — اس غفلت کی تلافی کا ہمیں بار بار موقع ملا لیکن ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکے بلکہ ہماری ملی جد و جہد کا رُخ "ترکستان" کی طرف رہا۔

کروڑوں انسانوں کے اس ملک میں حلقۂ پیام انسانیت کی دعوت خدا کرے کہ ماضی کی تلافی کر سکے یا کم از کم مستقبل کے اندیشوں کے لئے سدِّ راہ بن جائے۔ تعمیرِ حیات کا آئندہ شمارہ حلقۂ پیام انسانیت کے سہ روزہ کنونشن کی تفصیلات پر مشتمل خاص نمبر ہوگا، اس میں اغراض و مقاصد اور طریقۂ کار پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔

مولانا شاہ عز الدین ندویؒ

مادرِ علمی دار العلوم ندوۃ العلماء کے ایک نامور فرزند مولانا شاہ عز الدین ندوی رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تحریک ندوۃ العلماء کے بانی ارکان میں سے ایک اہم شخصیت حضرت مولانا شاہ سلیمان صاحبؒ کے مرحوم نواسے تھے، ابتدائی تعلیم مدرسہ حمیدیہ دربھنگہ میں حاصل کی بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ ندوہ کے ممتاز فارغین میں آپ کا شمار تھا، دار العلوم ندوۃ العلماء میں عرصہ تک مدرس رہے، شاہی مسجد لاہور کے ایک عرصہ تک امام و خطیب بھی رہے پھر ۱۳۶۷ھ مدرسہ اسلامیہ رانچی میں پرنسپل رہے، آخر میں مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں تدریسی خدمات کے ساتھ وہاں شعبہ عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں بھی خدمت انجام دیتے رہے۔

۱۹۷۷ء میں علوم عربیہ اور عربی زبان و ادب کی اعلیٰ قابلیت و صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت ہند نے مرحوم کو ایوارڈ بھی دیا تھا۔ ان کی تصنیفات میں "علوم الحدیث" "کشف الظلام" "حیات احمد بن حنبل اور سیدات اسلام قابل ذکر ہیں۔

مولانا موصوف نے بیعت طریقت اپنے نانا حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی سے کیا تھا اور ان کی طرف سے مجاز بیعت بھی تھے۔

مولانا مفتی عتیق میاں فرنگی محلیؒ

ممتاز عالم دین اور خانوادۂ فرنگی محل کے رکن مولانا مفتی محمد عتیق میاں فرنگی محلی کا ۲۶ مئی کو انتقال ہو گیا۔

مولانا مرحوم فرنگی محل کے تو تدریسی روایات اور تہذیب و ثقافت کے اس وقت واحد علمبردار تھے، ان کی تعلیم مدرسہ عالیہ عربیہ فرنگی محل میں ہوئی اور اپنے زمانہ کے ممتاز علماء اور اساتذہ سے آپ نے پڑھا، مولانا مرحوم کا تعلق فرنگی محل کی اس شاخ سے تھا جس کا براہ راست سلسلہ علامہ بحر العلوم سے ہوتا ہوا بانی درس نظامی ملا نظام الدین سہالویؒ اور ملا قطب الدین شہید سہالوی تک پہونچتا ہے، اس طرح انکے جدی سلسلے میں ایسے علماء شامل تھے جنھوں نے ہندوستان کو علوم دین کے میدان میں بین الاقوامی شہرت کا حامل بنا دیا۔ مولانا مرحوم تقریباً ۵۰ کتابوں اور حاشیوں کے مصنف تھے مرحوم نے اپنی زندگی سیاسی اور سماجی ہنگاموں سے الگ رہ کر دینی اور علمی خدمات میں بسر کی اور فتاویٰ نویسی کی خدمت آخر وقت تک انجام دیتے رہے۔ اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے۔ آمین

مرتبہ علاء الدین رانچوی ندوی

رُوداد حلقۂ پیامِ انسانیت

سہ روزہ کنونشن

۲۰، ۲۱، ۲۲ مئی ۱۹۷۷ء کو حلقۂ پیام انسانیت کا سہ روزہ کنونشن ندوۃ العلماء کے وسیع و عریض عباسیہ ہال میں منعقد ہوا۔ موسم کی سختی، الکشن کا زمانہ اور سیاسی سرگرمیوں کے باوجود مولانا علی میاں ندوی کے ایماء پر نہایت عجلت کے ساتھ یہ پروگرام طے ہوا۔ اس کی پہلی نشست ۲۰ مئی کو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی افتتاحی تقریر سے ہوئی۔ ان سے پہلے مولانا اسحٰق جلیس صاحب ندوی نے پیام انسانیت کا مختصر مگر جامع تعارف کرایا اور اس کے قیام کے محرکات و پس منظر کا ذکر کیا اس کے بعد حضرت مولانا نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ: آپ نے کسی پرندہ کو آشیانے پر تیشہ چلاتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا لیکن آج کے ہزاروں انسان نہایت دلیری بلکہ نہایت خلوص کے ساتھ اپنے آشیانے پر تیشہ چلا رہے ہیں۔ انسانیت کی عزت و حرمت کو پامال کر رہے ہیں اور انسان اتنا غافل و بے خبر ہو چکا ہے کہ اسے یہ بھی علم نہیں رہا کہ جس شاخ پر وہ تیشہ زنی کر رہا ہے اور جس آشیانے کو ویران و برباد کرنے پر کمربستہ ہے وہی سارے آشیانہ کی جڑ ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ دراصل یہ انسانیت کی خودکشی ہے اور خودکشی کا یہ عمل پوری توانائی اور پوری طاقت کے ساتھ سارے ممالک کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ ایک عام انسان انھیں راستوں سے نقصان پہونچا سکتا ہے جو اس کے علم و فہم میں ہوں لیکن ایک پڑھا لکھا اور qualified انسان ایسے طریقوں سے سائنس اور ٹکنالوجی کے راستوں سے نقصان پہونچا سکتا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اگر یہ شاخ ٹوٹ گئی تو ساری انسانی کوششیں تعلیمی ادارے ادب، شاعری صحافت و ریڈیو غرض کہ زندگی کا ہر شعبہ بیکار ہے۔ اگر انسانیت کی یہ کشتی اپنے صالح اجزاء کے ساتھ ڈوبی تو سب کچھ ڈوبا میں خطرے کی گھنٹی بجا رہا ہوں میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ دولت کی پوجا اور ہوس جب دل و دماغ پر چھا جاتی ہیں تو اس وقت نہ تو اقرباء و رشتہ دار، نہ خاندان نہ پاس پڑوس نہ والدین و اولاد کسی کی بھی عزت و حرمت باقی نہیں رہتی۔ ہوس کے علاوہ ساری حقیقتیں مرجاتی ہیں۔

آخر میں مولانا نے فرمایا کہ پیام انسانیت کی تحریک دراصل اس کھٹک اور چبھن کا نتیجہ ہے جو مستقل آزادی کے بعد سے اور آزادی سے پہلے میرے قلب و دماغ میں کھٹکتے رہے ہیں۔ الٰہ آباد سے یہ کام ۱۹۷۴ء میں شروع ہوا۔ اس سے تعاون میں انسانیت اور اخلاق کا فروغ ہوگا۔

دوسری نشست: اسی دن

۵½ بجے شام کو اعلان کے مطابق مولانا عبد الکریم باریکھ (ناگپور) کی تقریر ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ ہندوستان خوبصورت پھولوں کا حسین گلدستہ ہے سینکڑوں تہذیبوں کا سنگم ہے۔ انہوں نے قرآنی آیتوں سے بتایا کہ قرآن انسانیت کو عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہزاروں جگہ اس نے (یا ایھا الناس۔ اے انسانو!) کہہ کر پکارا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یہاں کے ہندوؤں نے مسلمان بزرگوں کو اپنی آنکھوں پر بٹھایا لیکن جب یہی مسلمان بادشاہت اور کشور کشائی کی نیت سے آئے تو انکے دلوں میں نفرت کی آگ پیدا ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ یہ ملک خدا بیزار، خدا ناشناس لوگوں سے پاک ہے۔ اس دھرتی نے ہمیشہ ایک خدا (ایشور) کی پوجا کی ہے اور والدین (ماتا پتا) کی عزت و احترام کا ہر ممکن لحاظ رکھا ہے۔ آپ کی دلپذیر تقریر کے بعد ۹ بجے شب ۲۰ مئی کا پروگرام ختم ہو گیا۔

۲۱ مئی

۲۱ مئی بروز سنیچر ٹھیک ۹½ بجے صبح مولانا عارف صاحب ندوی استاذ ندوۃ العلماء کی تقریر سے جلسے کی کارروائی کا آغاز ہوا۔ انہوں نے انسانیت کی اہمیت کو بتاتے ہوئے یہ بتایا کہ انبیاء انسان کی حیثیت سے پہلے اور نبی کی حیثیت سے بعد میں آئے ہیں، مولانا نے طلباء ندوہ، اساتذہ اور لکھنؤ کے باشندگان سے اپیل کی کہ اولیں ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے۔

انہوں نے مزید کہا مولانا حضرت علی میاں مدظلہ ایک داعی پیدا ہوئے ہیں اور داعیانہ صفات لے کر اس دنیا میں اُبھرے ہیں ان کے اندر دنیا داری، تملق چاپلوسی نہیں ہے۔

انہوں نے کہا کہ اگر انسانیت جاگ گئی تو اچھے شاعر، اچھے ادیب، اچھے فنکار، اچھے سیاستداں، اچھے منتظم اور اچھے انسان پیدا ہوں گے اگر یہ ضمیر نہ جاگا تو ہر ایک کا قلم اغراض کا رنگ بھرتا رہے گا۔ آپ کے بعد سیتارام دویدی ایڈوکیٹ نے مختصر تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ سارے عالم کے لئے ہے انہوں نے بتایا کہ ملک کے سارے سیاستداں حتیٰ کہ آزادی کے رہنما و نوبا بھاوے اور جے پرکاش جی کو بھی مولانا کے سامنے خاموش ہونا پڑا انہوں نے کہا کہ آج کی حقیقی آزادی مولانا ہی کی دین ہے۔

ان کے بعد پروفیسر رشید کوثر فاروقی بھٹکل کالج نے تقریر کی۔ آپ نے خاص طور سے فرمایا کہ یہ وحدتِ ادیان کی تحریک نہیں نہ ہی ایسا ہے کہ تمام مذاہب سچے اور اچھے ہیں یہ خیال اگر کسی کے ذہن میں ہے تو سراسر غلط ہے۔ آپ کے بعد مولانا عمران، مولانا عبد الستار صاحبان نے جو سنبھل سے تشریف لائے تھے اپنے

اپنے خیالات پیش کئے۔ پھر مولانا عبد الکریم صاحب باریکھ نے ایک مختصر تقریر کی اور آخری تقریر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے کی۔ آپ نے فرمایا کہ بہت سی چیزوں کے لئے اصول و قوانین متعین کرنا دشوار ہوتا ہے پھر بھی آپ نے دو تین چیزوں کی طرف توجہ مبذول کرائی اور فرمایا کہ سب سے پہلے انسان اپنے اندر خلوص پیدا کرے پھر عقل سلیم۔ اور تیسری چیز محنت و تجربہ۔

ان ہدایات کے بعد پہلی نشست ۱۲ بجے دن میں ختم ہو گئی۔

دوسری نشست:

۲ بجے دوسری نشست کا آغاز ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب الٰہ آبادی کی تقریر سے ہوا انہوں نے دستور ہند کی دفعہ ۴۸ کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ اگر اس دفعہ میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی گئی تو یہ تحریک وسیع پیمانے اور ملک گیر طریقے سے چل سکتی ہے۔ آپ کے بعد شری دامودر جین (بریلی) نے تقریر کی۔ انہوں نے بتایا کہ نفس پرستی اور خدا پرستی یہ دو چیزیں ہیں۔ خدا پرستی کو پانے کے لئے نفس پرستی کو پامال کرنا پڑے گا۔ انہوں نے بتایا کہ انسانوں کے اندر سے ان کا نخوت، ان کا تکبر و غرور اور ان کی انانیت اس وقت ختم ہوگی جب وہ کمزوروں، ضعیفوں، بیماروں کی خدمت کریں۔ خاص چیز نفس کی قربانی ہے قربانی کے بغیر کوئی بھی کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اس طرح مختلف مندوبین کے خیالات کے بعد مولانا نجم الدین ندوی کا ایک مقالہ "اخلاقی بنیادوں کی تلاش" پیش کرنے کے بعد یہ نشست ۵ بجے ختم ہو گئی۔ شام کے ۷½ بجے حضرت مولانا مدظلہ نے "ایک قیدی کا پیام اپنے جیل کے ساتھیوں کے نام" کے عنوان پر تقریر فرمائی۔ جلسہ گاہ کے علاوہ پارکوں میں لوگ بڑی تعداد میں بیٹھے تقریر سنتے رہے۔

مولانا نے اپنی تقریر میں حضرت یوسفؑ کا ذکر نہایت ہی مؤثر اور دلپذیر انداز میں بیان کیا۔ آپ نے حضرت یوسفؑ کی شرافت، دیانت، صداقت، انسانیت اور آزمائش اور ان اعلیٰ صفات کا جن میں وہ کامل و اکمل تھے بڑے ہی اچھے پیرایہ میں ذکر کیا۔ اور ٹھیک ۹ بجے یہ تقریر ختم ہو گئی۔

۲۲ مئی

۲۲ مئی کنونشن کا آخری دن تھا وقت کی پوری پابندی کرتے ہوئے ۹½ بجے جلسہ شروع ہو گیا۔ پروفیسر آفاق صاحب صدیقی جامعہ ملیہ نے ایک علمی تجزیہ پیش کی

(بقیہ صفحہ ۔۔)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

خطبۂ افتتاحیہ

آل انڈیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کنونشن

مُنعقدہ دہلی ۱۰، ۱۱ر مارچ سنہ ۱۹۷۳ء

(چار سال قبل دیئے ہوئے اس خطبۂ افتتاحیہ میں جن خطرات کی نشاندہی کی گئی تھی واقعہ کی صورت میں سامنے آئے)۔

حضرات! آپ نے آل انڈیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کنونشن کے افتتاح کا موقع عنایت فرما کر مجھے ایک عزت بخشی ہے جس کے لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں، ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں اس عظیم دانشگاہ نے جو اہم تعلیمی، سیاسی علمی اور فکری کردار ادا کیا ہے، اور ملت ہندیہ اسلامیہ کو جوان نازک ترین حالات و مسائل سے دو چار تھی، جن سے ملت اسلامی کی کوئی دوسری برادری، اور وسیع دنیائے اسلام کا کوئی دوسرا حصہ دو چار نہ تھا، لائق رہنما، کارکن، ادیب، خطیب، شاعر، منتظم اور غیور و جری سپاہی مہیا کئے جن کی کوئی مثال دنیائے اسلام کے کسی جدید تعلیم کی دانشگاہ کی تاریخ میں نہیں ملتی، اس کے فرزندوں نے تقریباً ایک صدی تک علم و تہذیب، اور سیاست و عمل کے جس وسیع ترین محاذ پر اپنی جدوجہد جاری رکھی، اس کی مثال بھی کسی دوسرے ملک میں ملنی مشکل ہے، اس لئے ایک ایسی مجلس اور مذاکرہ کے آغاز کا نازک فرض انجام دینا ایک ایسے فرد کے لئے یقیناً عزت کی بات ہے، جس کو ایک دن بھی اس موقر اور نامور درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے کی عزت حاصل نہیں ہوئی، آپ نے اس انتخاب سے جہاں اپنی فراخدلی اور وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے وہاں اس کا بھی عملی ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ نے ہندوستان کے ہر حلقہ اور ملت اسلامیہ کے ہر طبقہ کو متاثر اور متفکر بنا دیا ہے، گویا اسی دہلی کے نامور استاذ شاعر مرزا محمد رفیع سودا نے اسی موقعہ کے لئے کہا تھا ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

اس موقعہ پر بے اختیار یہ واقعہ یاد آجاتا ہے کہ جب سنہ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان سے آپ کی اسی دانشگاہ کے لائق اور نامور فرزند رئیس الاحرار مولانا محمد علی قیادت میں مسلمانان ہند کا ایک وفد لندن جانا تجویز ہوا، تاکہ وہ حکومت برطانیہ کے ذمہ داروں کے سامنے خلافت کے بارے میں مسلمانان ہند کے خیالات و جذبات کی ترجمانی کرے، تو مولانا محمد علی نے اس وفد کی شرکت و رفاقت، اور مسلمانوں کے دینی نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے اس وقت کے ایک ممتاز عالم دین مولانا سید سلیمان ندوی کا انتخاب کیا، اس وفد کے ارکان جن مختلف حلقوں سے انتخاب کئے گئے تھے، اور ان کی ثقافت و لباس میں جو رنگارنگی تھی، اس کی طرف حکومت کے ایک ذمہ دار نے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ "ہندوستان میں کسی چیز میں اتحاد نہیں پایا جاتا، اور وہ مختلف تہذیبوں، اور ثقافتوں کا ایک بوقلموں مرقع ہے"۔ مولانا محمد علی نے جن کی حاضر دماغی، اور حاضر جوابی شہرہ آفاق ہے، اس کا برجستہ جواب دیا، کہ "یہی اس بات کی دلیل ہے کہ مسئلہ خلافت نے ہر مکتب خیال، اور ہر حلقہ اور طبقہ کو ایک نقطۂ نظر پر متحد اور جمع کر دیا ہے، اور یہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے دل کی آواز ہے"۔ اس کو حسن اتفاق کہیے، یا سوء اتفاق کہ لندن کی بیگانہ سرزمین پر نہیں، بلکہ دہلی کی عزیز سرزمین پر تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے اور ہندوستان کے مختلف حلقوں کے نمائندے اور قدیم و جدید نظام کے ساختہ پرداختہ ایک جگہ جمع ہو رہے ہیں، تاکہ اس مسئلہ میں جو بہت سی حیثیتوں سے مسلمانوں کی آئندہ تعلیم و تہذیب اور ان کے مستقبل کی تشکیل میں ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے، اپنے اصلی خیالات اور دلی جذبات کا اظہار کر سکیں۔

حضرات! میں اس مختصر وقت اور فرصت میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج —— (M.A.O. College) کے قیام اور تاسیس کی تاریخ بیان کرنے میں آپ کا قیمتی وقت صرف نہیں کروں گا، نہ اس پس منظر کا ذکر کروں گا جس میں یہ جدید تعلیمی مرکز قائم ہوا، نہ ان مشکلات اور ناساعد حالات کا تذکرہ کروں گا جن میں یہ تحریک شروع کی گئی نہ اس حقیقت کی توضیح پر آپ کا قیمتی وقت ضائع کروں گا کہ وہ مسلمانان ہند کی امنگوں اور تمناؤں کی تکمیل کا بہترین ذریعہ اور ان کی ذہانتوں اور صلاحیتوں کے اظہار کا نصف صدی سے زائد مدت تک سب سے بڑا میدان رہا ہے، نہ اس کا ذکر کروں گا کہ وہ بہت سے وجوہ سے جن میں بحث و نظر کی بہت گنجائش ہے، ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے قیمتی ملی اثاثہ، اور ان کی عظمت قومی کا نشان بن گیا ہے کہ یہ سب حقیقتیں کم سے کم اس تعلیمیافتہ مجمع اور اس دانشگاہ کے ابنائے قدیم اور جاں نثاروں کے یہاں معروف و مسلّم ہیں اور وہ نہ صرف ان سے آشنا بلکہ ان کے داعی اور مبلغ ہیں میں یہاں صرف اس حقیقت کا اظہار کرتا ہوں کہ ایک آزاد مسلم یونیورسٹی کا قائم کرنا ابتدا سے ان کے بلند نظر اور عالی ہمت بانی کا نصب العین تھا، سرسید کا خیال تھا کہ جب تک مسلمانوں کی تعلیم گورنمنٹ کی مداخلت سے کلیۃً "آزاد" اور خود مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ ہوگی، مسلمانوں کو پورا فائدہ نہ پہونچے گا۔ سنہ ۱۸۷۳ء میں سرسید کے نامور فرزند سید محمود مرحوم نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق جو اسکیم شائع کی تھی، وہ سرسید کے خیالات کا آئینہ ہے، انہوں نے ایک ایسی اسلامی یونیورسٹی کا نصب العین پیش کیا جو کیمبرج اور آکسفورڈ کی طرح حکومت وقت کے اختیارات سے آزاد ہو، سرسید کی وفات کے بعد ان کے رفقا کا بھی یہی نصب العین رہا، چنانچہ ان کی وفات کے چند ماہ بعد دسمبر سنہ ۱۸۹۸ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس جو لاہور میں منعقد ہوا، اس میں محمڈن یونیورسٹی کی ضرورت پر زبردست تقریریں ہوئیں، اور اس کی تائید میں ریزولیشن پاس کیا گیا۔

جن لوگوں کو سرسید اور ان کے رفقاء کے حقیقی خیالات اور مقاصد کا علم ہے وہ جانتے ہیں کہ سرسید کے ذہن میں جدید تعلیم کی اشاعت اور مسلمانوں کی ایک نئی تعلیم یافتہ نسل کے پیدا کرنے سے زیادہ (جو چھوٹی بڑی اسامیوں پر فائز ہو) مسلمانوں سے احساس کہتری کا دور کرنا، ان کو اس شکست کے بدترین نفسیاتی اور اخلاقی اثرات سے بچانا جو سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کو اٹھانی پڑی تھی، ان کے اندر حوصلہ مندی اور خود اعتمادی پیدا کرنا، اور ان کو اپنی مخفی یا مجہول، ذہنی و انتظامی صلاحیتوں سے آشنا کرنا تھا، جن کی مدد سے انہوں نے آٹھ سو برس تک اس ملک میں حکومت کی اور جدید ہندوستان کی تعمیر کا فرض انجام دیا، اور وہ تعلیمی و تعمیری شاہکار یادگار چھوڑے جن کے اجاگر اور روشن کرنے کے لئے سرسید نے "آثار الصنادید" جیسی کتاب لکھی، جو ان کی اگر سب سے بہتر تصنیف نہیں تو بہترین تصانیف میں ضرور ہے، جنھوں نے ان کے "تہذیب الاخلاق" کے مضامین اور ان کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" پڑھی ہے وہ اسی خیال کی تائید کریں گے۔

سرسید کا مقصد ایک ایسے تعلیمی مرکز کے قیام سے بلند تھا، جس کا کام طوطے کی طرح پڑھا دینا اور اقبال کی زبان میں بلبل و طاؤس کی تقلید" کا سبق دینا تھا، ان کا قلعۂ معلی سے قریبی تعلق رہا ہے، انہوں نے مسلمانوں کے اقتدار کے "چراغ کشتہ" کی آخری بھڑک دیکھی تھی) وہ اپنی اس "زمانہ شناسی" کے باوجود (جس میں وہ بدنامی کی حد تک نامور ہیں) ملی غیرت، اور قومی حمیت کے اس جوہر سے مالامال تھے، جو شاید اس وقت کے بڑے بڑے قوم پرست اور ترقی پسند رہنما کے اندر نہ پایا جاتا ہو۔

انہوں نے انگلستان کے طویل قیام میں اس حقیقت کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا کہ کیمبرج اور آکسفورڈ کی آزاد درسگاہوں نے برطانوی قوم کی زندگی اور اخلاق پر کتنا گہرا اثر ڈالا ہے، ان کے فضلاء نے کیسے نازک وقتوں میں قوم اور اس کے معاشرہ کی مدد کی ہے، اور اس جمہوری روح اور ذہن کو جو انگریز قوموں کا طرۂ امتیاز اور اس کے عالمگیر اقتدار کا راز رہا ہے، اور جس کی بدولت وہ دو دو عظیم جنگوں سے زندہ اور طاقتور ہو کر نکلی، اس کو کس کس طرح سے بچایا ہے، انہوں نے ایک تعلیمی مبصر اور ذہین انسان کی طرح ان تعلیمگاہوں اور حکومت کے تعلقات کی نوعیت پر بھی غور کیا ہوگا جو صدیوں سے چلے آ رہے تھے، اور ان اصحاب کی ایک مقدس روایت، اور انگریزوں کا سرمایۂ افتخار بن گیا تھا، انگریزی زبان سے ناآشنا ہونے اور سن رسیدگی کی وجہ سے اس حقیقت کے ادراک میں ان کو جو دقت پیش آئی ہوگی، اس کو ان کے ذہین اور لائق فرزند سید محمود نے پورا کر دیا ہوگا، جن کو ان درسگاہوں کا عملی تجربہ تھا، اور جنھوں نے طالب علم بن کر اس آزادی اور تعلیمگاہوں کی خود مختاری اور ان کی عزت و وقار کا نہ صرف مشاہدہ بلکہ تجربہ بھی کیا، اور اس کی لذت سے وہ اس طرح شادکام ہوئے کہ ہندوستان کے غلام اور محکوم ماحول میں اگر بھی وہ اس کو فراموش نہ کر سکے انہوں نے سنہ ۱۸۷۳ء میں مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق جو اسکیم شائع کی تھی، اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:-

"جب تک کہ ہم ایسی چیزوں کی نسبت بھی جو ہماری ذاتی باتوں سے متعلق ہیں (جیسی کہ تعلیم ہے) گورنمنٹ پر بھروسہ کریں گے تو درحقیقت اس شے کے حاصل کرنے کی توقع کرتے ہیں، جس کا حاصل کرنا بالکل ناممکن ہے، سب سے عمدہ مدارس تعلیم علوم کے یوروپ میں بالکلیہ یا قریب اس کے اس ملک کی گورنمنٹ کی مداخلت اور انتظام سے علٰحدہ ہیں۔"

لیکن اس آزاد یونیورسٹی کا تخیل جس کا نظم و نسق واضح طریقہ پر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، ایک خواب بے تعبیر بنا رہا، سنہ ۱۹۱۰ء میں بعض سیاسی اسباب کی بنا پر ہز ہائینس سر آغا خاں نے اس تحریک کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی، اور مسلمانوں کی خفتہ تمنائیں بیدار ہو گئیں، پورے ملک میں اس کی عام تحریک شروع ہوئی، سرسید کے رفقاء قدیم نواب وقار الملک وغیرہ نے اس کی پوری تائید کی، شہر شہر جلسے ہوئے، یونیورسٹی کی تحریک کا وفد سر آغا خاں کی قیادت میں دروازہ دروازہ گیا، اس تحریک میں مسلمانوں کے لئے جو کشش پائی جاتی تھی اور اس میں ان کو اپنی قومی امنگ کی تکمیل کا جو سامان نظر آتا تھا، اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اس یونیورسٹی کے قیام کے لئے تھوڑے دنوں میں ۳۰ لاکھ کی مطلوبہ رقم جمع ہو گئی، آپ اگر اس وقت کے حالات اور اس رقم کی قوت خرید اور افادیت کا صحیح اندازہ کریں تو یہ رقم آپ کو کروڑوں کی معلوم ہوگی۔

اس تحریک میں بھی کالج کے حقیقی بہی خواہوں اور سرسید کے صحیح جانشینوں نے اس پہلو کو کبھی نظر انداز نہیں کیا، کہ یہ یونیورسٹی حقیقی معنی میں مسلمانوں کے انتظام اور اختیار میں ہوگی، اور اس پر ان کا اقتدار اعلیٰ قائم ہوگا، انھیں کے نمائندے جو آزادانہ اور جمہوری اصولوں کے مطابق منتخب کئے جائیں گے، اس یونیورسٹی کے نظم و نسق پر حاوی اور اس کے لئے مسلمانوں کے سامنے جوابدہ، اور ذمہ دار قرار پائیں گے، ان کو صرف اسی صورت میں یونیورسٹی کا قیام منظور تھا، اور وہ اس کے لئے اس جد و جہد اور قربانی کو حق بجانب سمجھتے تھے جو اس کے قائم کرنے کے لئے دی جا رہی تھی، جب مجوزہ یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن مرتب کر کے ۹ر اگست سنہ ۱۹۱۱ء کو شائع کیا گیا، تو ہندی مسلمانوں کے سب سے بڑے با اصول و صاحب ضمیر رہنما، اور علی گڑھ تحریک کے سب سے زیادہ دیانتدار اور جری قائد نواب وقار الملک مرحوم آنریری سکریٹری M.A.O. کالج نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قوم کے سامنے ایک یادداشت پیش کی، اس میں ایک ٹکڑا یہ بھی تھا کہ:-

"اعلیٰ حکمراں جماعت جس طرح اب تک کالج میں صرف مسلمانوں سے مرکب ہے، اسی طرح آئندہ بھی یہ اعلیٰ حکمرانی صرف مسلمان ٹرسٹیوں کے ہاتھ میں رہنے کے واسطے مسودہ میں تجویز کی گئی ہے اور جس قدر اس وقت مسلمان ٹرسٹی کالج میں ہیں وہ سب کے سب بطور کورٹ آف ٹرسٹیز کے یونیورسٹی کی اعلیٰ جماعت حکمراں متصور ہوں گے۔ جس طرح اس وقت ٹرسٹیوں کا سنڈیکیٹ صرف مسلمانوں ٹرسٹیوں سے مرکب ہے، اسی طرح آئندہ یونیورسٹی میں بھی وہ جماعت از نام "کونسل" کورٹ آف ٹرسٹیز کے ماتحت بطور ایک کارپرداز جماعت کے صرف ٹرسٹیز (یعنی مسلمان ممبروں) سے مرکب ہوگی۔"

پھر جب ۲۳، ۲۴ر جون سنہ ۱۹۱۲ء کو کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا جو جلسہ مسودۂ قانون پر غور کرنے کے لئے لکھنؤ میں منعقد ہونے والا تھا اور اس مسودہ میں بہت کچھ ترمیمیں ہو گئی تھیں، تو نواب صاحب مرحوم نے اپنی علالت اور معذوری کے باوجود قوم کو آگاہی دی، انہوں نے تحریر فرمایا کہ:-

"اس (ترمیم شدہ) مسودۂ قانون پر جہاں تک مجھ کو غور کرنے کا موقعہ ملا ہے وہ بہت زیادہ اصلاح کا محتاج ہے اور جو کچھ اس میں اس وقت درج ہے اگر بدقسمتی سے وہی اخیر وقت تک قائم رہ جائے، تو میں صاف یہ رائے دوں گا کہ ایسی یونیورسٹی کو ہمیں دور ہی سے سلام کرنا چاہئے جس کے ریگولیشنز کے ذریعہ ہم اپنی اس آزادی کو بھی کھو بیٹھیں گے جو آج ہم کو علی گڑھ کالج کی موجودہ حالت اور موجودہ قانون کے بموجب حاصل ہے؟"

مسلمانوں کے اسی جذبہ کی کہ یونیورسٹی کا نظم و نسق، اور اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگا، سب سے ترجمانی علامہ شبلی نعمانی نے اپنے ایک شعر میں کی، جو ان کی اسی مشہور نظم کا مطلع ہے، جو انہوں نے لاہور کے جلسۂ استقبالیہ میں پڑھی تھی وہ فرماتے ہیں کہ ؎

ہمیں یک حرف از یونیورسٹی مدعا باشد
کہ ایں سررشتۂ تعلیم با در دست ما باشد

اس سے بہتر اور بلیغ تعبیر اس حقیقت کی نہیں ہو سکتی، کہ جن کی تعلیم کا یہ سررشتہ ہے انہیں کے ہاتھ میں رہے اور وہ اس کو اپنی ضرورت کے مطابق پھیلا اور سمیٹ سکیں، اسی وقت وہ اس کی پوری گرمجوشی کے ساتھ حفاظت کریں گے، اور اس کو اپنے سینہ سے لگائے رکھیں گے۔

حضرات! یونیورسٹی کے قیام اور تاسیس کی کہانی بہت طویل ہے اور تلخ و شیریں حقائق، رزم و بزم کے مناظر اور قانونی و دستوری معرکہ آرائیوں کے واقعات سے بھری ہوئی، وہ اب ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک ضروری باب بن گیا ہے، جس کو مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں (جو افسوس ہے کہ ابھی تک مناسب طریقہ پر نہیں لکھی گئی) اور "الہلال" کے فائلوں میں پڑھا جا سکتا ہے، اس کو یہاں نہ دہرانے کی گنجائش ہے اور نہ آپ کو اس کی ضرورت، مختصر یہ ہے کہ اس تحریک کے علمبرداروں کی کوشش سے جن میں مہاراجہ محمود آباد، سر علی محمد خاں پیش پیش تھے، سنہ ۱۹۲۰ء میں مسلمانوں کو یونیورسٹی کا چارٹر مل گیا، اس کا جو قانون (کانسٹی ٹیوشن) منظور کیا گیا، اس میں اگرچہ بزرگوں میں نواب وقار الملک اور نوجوانوں میں مولانا

ابوالکلام آزاد کی خواہش اور معیار کے مطابق مسلمانوں کو وہ اختیارات، اور تحفظات نہیں دیے گئے جن کا مطالبہ کیا گیا تھا، لیکن اس قائم ہونے والی یونیورسٹی پر انتظامی اقتدار اعلیٰ مسلم یونیورسٹی کورٹ کا تسلیم کیا گیا، جس کے ممبران مسلمانوں کی مختلف جماعتوں، تنظیموں، مکاتب خیال، معاونین، ہمدردوں اور خود یونیورسٹی کے عملہ سے منتخب ہو کر آتے تھے، یونیورسٹی میں اکیڈمک کونسل اور ایگزیکیٹو کونسل کے نام کی دو جماعتوں کی موجودگی کے باوجود آخری فیصلہ یونیورسٹی کورٹ ہی کے ہاتھ میں تھا، وہی وائس چانسلر منتخب کرتی تھی، وائس چانسلر کے اختیارات بھی محدود تھے، اس طرح مسلمان ملت کی بالاتری، اور اس کا نفوذ و اثر اس یونیورسٹی میں موجود تھا، اور یہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک بڑے اطمینان و اعتماد کا موجب تھا جس کی وجہ سے وہ اپنے جگر گوشوں کو بڑی مسرت اور طمانینت کے ساتھ اس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجتے تھے، اس نیم خود مختارانہ ماحول میں ان کی صلاحیتیں اور توانائیاں نشوونما پاتی تھیں، وہاں ان کے اندر جرأت، حوصلہ مندی اور خود اعتمادی پیدا ہوتی تھی اور ان کی ذہانتیں اور صلاحیتیں بغیر کسی رکاوٹ کے سیل رواں کی طرح ابھرتی اور ابلتی تھیں اور زندگی کے ہر شعبہ کو شاداب اور سیراب کرتی تھیں، یونیورسٹی کا عوام اور ہندوستانی مسلمانوں کے ذہین اور باصلاحیت طبقہ سے براہ راست ربط تھا اور اس کے ذریعے اس کے درخت میں نمو اور شادابی اور برگ و بار لانے کی صلاحیت پیدا ہوتی تھی جو ایک آزاد قومی دانشگاہ کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

۱۹۴۷ء میں آزاد قومی حکومت کے قائم ہونے سے اس کی امید تھی کہ اس یونیورسٹی کی وہ نیم خود مختارانہ حیثیت قائم رہے گی جو ۱۹۲۰ء کے ایکٹ نے اس کو عطا کی تھی، اس لئے کہ قومی حکومت کا سب سے بڑا انعام اور اس کے قیام کا سب سے بڑا فائدہ قومی امنگوں اور آرزوؤں کی تکمیل، مختلف فرقوں اور اقلیتوں میں نہ صرف اپنی جان و مال اور عزت و آبرو بلکہ ان عقائد و مقاصد اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ کا بھی یقین ہے، جو ایک بامقصد اور صاحب ضمیر انسانی جماعت کو اکثر اوقات جان و مال اور عزت و آبرو سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اور یہی اس کے اور جیتے پالتو جانوروں کے درمیان (جن کی جان کی سلامتی اور راتب کا عام طور پر گھروں میں انتظام کیا جاتا ہے) خط فاصل ہے،

یہ امید دستور کے اس دفعہ کی روشنی اور سایہ میں یقین کے درجہ تک پہونچ جاتی تھی کہ "ہر اقلیت اور فرقہ کو اپنی مرضی کے مطابق اپنی تعلیمی اور دوسرے قسم کے اداروں کو قائم کرنے ان کا انتظام کرنے اور ان کو جاری رکھنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی۔"

لیکن یہ امید غلط ثابت ہوئی اور حکومت کی طرف سے پے درپے ایسے اقدامات کئے گئے، جن سے ایک بدیشی حکومت کے دیے ہوئے حقوق بھی مجروح بلکہ سلب ہونے شروع ہو گئے، ۱۹۶۵ء کے یونیورسٹی ایکٹ کی ترمیم کے ذریعہ ایڈمنسٹریشن ایک نئی ایگزیکیٹو کونسل کے ہاتھ میں دیدیا گیا جو نو اشخاص پر مشتمل تھی، جو سب حکومت کی طرف سے نامزد کئے گئے تھے، کورٹ اکیڈمک کونسل اور پرانی ایگزیکیٹو کونسل معطل کردی گئی اور تمام اختیارات اس نئی ایگزیکیٹو کونسل کو دیدیے گئے جس کو مرکزی حکومت کی نگرانی میں کام کرنا تھا، پھر یکم جون ۱۹۷۲ء کو لوک سبھا میں مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ نہایت عجلت کے ساتھ پاس کردیا گیا، اس ایکٹ کے مضمرات اور نتائج پر آپ بہت سے تبصرے اور مضامین پڑھ چکے ہیں، اور اس موقر مجلس میں ان پر پھر ناقدانہ تبصرہ اور آزادانہ مذاکرہ ہوگا، خطبۂ صدارت بھی اس سلسلہ میں ہم کو رہنمائی اور روشنی دیگا، میں اس کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا لیکن اتنا کہے بغیر گذر نہیں سکتا کہ اس ایکٹ کی رو سے جو مسلم یونیورسٹی کورٹ، ایگزیکیٹو کونسل اور جو اکیڈمک کونسل بنتی ہے اور ان کے ممبروں کے انتخاب کرنے کے اختیارات اور صلاحیت جن جماعتوں اور افراد کو دی گئی ہے، اس کا تجزیہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض مرکزی حکومت اور اس کی ایجوکیشن منسٹری کے منشاء کو پورا کرنے والی فرمانبردار جماعتیں ہونگی ان میں مسلمانوں کی آزاد نمائندگی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا، خود مسلم یونیورسٹی کورٹ محض ایک مشاورتی ادارہ بن کر رہ گئی ہے، جس کا کام صرف تبصرہ کرنا اور ویزیٹر کے سامنے اظہار خیال کر دینا ہے، وائس چانسلر جو منسٹری آف ایجوکیشن کا انتخاب کردہ ہوگا۔ عملاً یونیورسٹی کا مختار کل اور ڈکٹیٹر ہوگا، جس کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔

اس سب سے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے تو ہرگز قیاس آرائی اور بدگمانی نہیں ہوگی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ۱۹۷۲ء کا ترمیمی ایکٹ حکومت کی کلیت پسندی، کمیونسٹوں کی آرزوں کی تکمیل، اور یونیورسٹی پر حکومت کے ذریعے ان کے اقتدار کی ضمانت ہے۔

حضرات! تاریخ جدید کا شاید سب سے بڑا سانحہ اور سیاست کی انسانیت کے حق میں سب سے بڑی زیادتی یہ ہے کہ ذہن و اخلاق کے سرچشمے، شخصیت و کردار کی کارگاہیں اور زندگی کی رہنمائی کرنے والے مرکز بے رحم اور بے ضمیر سیاسی مقاصد اور انتخابی مصالح کے تابع ہو جائیں اور وہ ان کے مستقبل اور ان کی موت و حیات کے بارے میں فیصلہ کن بن جائیں اس اصول کو تسلیم کرلینے کے بعد بھی کہ قومی حکومت، غیر ملکی حکومت کے مقابلہ میں قومی زندگی اور تعلیم و تربیت کے میدان میں رہنمائی کی زیادہ قابل اور اعتماد کی زیادہ مستحق ہے اور اب حکومتوں کا دائرہ اختیار ٹیکس وصول کرنے اور جان و مال کی حفاظت اور ملک کی دفاع تک محدود نہیں، میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ تعلیمی مرکزوں کو صنعتی کارخانوں، فیکٹریوں اور ملوں پر قیاس کرنا اور ان کو یکسر اپنے نظم و نسق میں لے لینا، ان کا رشتہ اس اقلیت، فرقہ یا جماعت سے کاٹ دینا، جس نے ان کو قائم کیا، اور اپنے خون پسینہ سے انکو پروان چڑھایا ایک بڑا سنگین اقدام ہے جس کے نتائج بڑے دوررس اور عمیق ہیں، کسی ملک میں ایک ہی طرح کے دل و دماغ کے ڈھالنے، ایک ہی طرح کی سیرتیں اور شخصیتیں پیدا کرنے اور ایک ہی طرح کے سیاسی خیالات و مقاصد رکھنے والوں کا گروہ وجود میں لانے کی کوشش، ملک اور معاشرہ کو ایک بڑے خطرہ سے دوچار کرنے کے مرادف ہے، یہ رویہ کسی شو فیکٹری اور کسی گن فیکٹری کے ساتھ تو مناسب ہے، لیکن دانشگاہوں، اور ذہنی تربیت کے مرکزوں کے ساتھ کسی طرح مناسب نہیں، تاریخ کی مسلسل شہادتیں ہیں کہ جب کسی وجہ سے کسی ملک اور معاشرہ پر کسی غلط فلسفہ یا رجحان کا تسلط اور اس پر کسی اعصابی دورہ کا حملہ ہوا، اور وہ کسی بے راہ روی، بے اعتدالی یا کسی شدید اخلاقی، ذہنی اور اجتماعی انتشار کا شکار ہوا، تو صرف دو مرکزوں سے اس کی چارہ سازی کا انتظام ہوا، انہوں نے اس سرسامی کیفیت کا مقابلہ کیا، بگڑے ہوئے حالات سے پنجہ آزمائی کی، اپنی جان، اور اپنے مستقبل کو خطرہ میں ڈالکر میدان میں آگئے، ان کی صدائے احتجاج اور مخالفت اگرچہ "نقارخانہ میں طوطی کی آواز" کے مرادف تھی، لیکن انہوں نے پوری بلند آہنگی اور بے خوفی سے بلند کی، یہاں تک کہ وہ اپنا اثر کئے بغیر نہ رہ سکی، اور اس جاں بلب ملک یا معاشرہ کو موت کے منہ سے نکال لیا۔ یہ مذہب اور تعلیم کے دو مرکز ہیں جنھوں نے ہمیشہ مریض قوموں کی دستگیری اور مسیحائی کی ہے اور انھیں سے وہ مصلح، ریفارمر اور انقلابی برآمد ہوئے ہیں، جنھوں نے ملک اور معاشرہ میں زندگی کی ایک نئی روح پیدا کردی ہے اور ان کی کشتی حیات کو ہمیشہ کے لئے غرق ہونے سے بچا لیا ہے یونان اور روما، مشرق اور خود یوروپ کی پوری تاریخ اس کی گواہ ہے، یہ نازک وقت پوری سیاسی بیداری دفاعی قوت، اور تعلیم کی ترقی کے ساتھ ہر ملک اور قوم پر آسکتا ہے، اگر ہماری تعلیمگاہیں کلیۃً حکومت کے اختیار اور اقتدار میں آجائیں وہاں ایک ہی طرح کا فلسفہ پڑھایا جانے لگے، ایک ہی طرح کے ماڈل تیار ہوں، ایک ہی سیاسی پارٹی اور اس کے مقاصد کا ان کو نقیب اور نقارچی بنا دیا جائے وہاں کے اساتذہ اور تعلیمی منتظم سرکار دربار کے چشم و ابرو کے اشارے کو دیکھنے والے ہوں تو پھر اس ملک کو تباہی سے بچایا نہیں جا سکتا۔

ایک کلیت پسند (TOTALITARIAN) حکومت جو درحقیقت خوف و اندیشہ، احساس کمتری اور اپنے عوام کے ساتھ بدگمانی اور بے اعتمادی کے مرض میں گرفتار ہوتی ہے اور جو ہر جوہر، ہر ذہانت اور ہر جرأت و خود اعتمادی کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتی اور اپنے مستقبل کے لئے خطرہ سمجھتی ہے، اکثر یہ خطرناک قدم اٹھاتی ہے وہ صرف صنعتوں، تجارتوں اور کمپنیوں کو نیشنلائز نہیں کرتی اور اپنے کنٹرول

میں نہیں لیتی، بلکہ تعلیمگاہوں، علم و دانش کے مرکزوں، تصنیفی اداروں، اور آخر میں ادب و شاعری اور فنون لطیفہ (FINE-ARTS) کو بھی اپنی نگرانی اور انتظام میں لینے کی کوشش کرتی ہے، اور ہر اس "مال" کو جعلی اور غیر قانونی قرار دیتی ہے، جس پر اس کا ٹھپہ نہ لگا ہو، خواہ وہ افکار و خیالات ہوں، خواہ ادبی و علمی شاہکار، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس ملک کی زندگی، زندہ دلی، جدت اور اپج سے محروم، تنوع اور رنگارنگی سے خالی اور جوش و خروش اور جذبۂ مسابقت سے عاری ہو جاتی ہے، تعلیمگاہیں، ایک لگے بندھے نظام کی غلام اور لکیر کی فقیر بن کر رہ جاتی ہیں، وہاں سے ایسے فضلاء پیدا ہونے بند ہو جاتے ہیں، جو عام سطح سے بلند اور غیر معمولی اور جینیس کہلانے کے مستحق ہوں، بلند قامت اور دیو پیکر انسانوں کے بجائے ہر شعبۂ زندگی میں کوتاہ قامت اور بالشتئے (PYGMIES) پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں، فلسفی اور مفکر، ادیب و شاعر یا تو کسی نئے خیال کا اظہار نہیں کرپاتے یا ان کو اس کی سخت سزا بھگتنی پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ بائیں بازو کے کلیت پسند (LEFT — TOTALITARIAN) ممالک میں ادیبوں، شاعروں، افسانہ نویسوں اور مفکروں کی خودکشی کے حوادث کثرت سے پیش آتے ہیں، ان حکومتوں نے مذہب اور تعلیم دونوں اداروں اور مرکزوں کو خاموش اور بے اثر بنا دیا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ وہاں تنقید و احتساب اور دعوت فکر کے لئے ایک آواز بھی بلند نہیں ہوتی اور وہاں موت کا سناٹا طاری ہے۔

ہمارے ملک میں کلیت پسندی کا رجحان پایا جانا، یونیورسٹی ایکٹس میں بار بار اور تیزی کے ساتھ ترمیم کا ہونا دستور ہند (جو اقلیتوں کا آخری سہارا اور پناہ گاہ ہے) میں بڑی سے بڑی تبدیلی کا چٹکیوں میں ہو جانا ایک شدید خطرہ کی علامت اور ایک بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔

مجھے آپ یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ جس کے لئے آپ جمع ہوئے ہیں، محض ایک یونیورسٹی کا مسئلہ نہیں ہے، یہ اس ملک میں ضمیر، عقیدہ و مسلک اور تعلیم و تربیت کی آزادی اور تحفظ کا مسئلہ ہے، ہم آپ اچانک چلتے چلتے ایک اہم اور فیصلہ کن دوراہے پر پہونچ گئے ہیں اور ہمارے سامنے سورج کی طرح روشن ایک سوالیہ نشان آکر کھڑا ہو گیا ہے، کیا اس ملک میں حقیقی جمہوریت پھلے پھولے گی یا یہ ملک کلیت پسندی (TOTALI — TARIANISM) کی منزل کی طرف تیزی کے ساتھ جائے گا، اور اشتمالیت (کمیونزم) کو ایک مسلک اور فلسفۂ حیات، اور ایک آئین اور دستور کی طرح پورے طور پر قبول کرے گا؟ اس لئے درحقیقت آپ اس جلسہ سے صرف اپنی جماعت اور اپنے ادارہ کی خدمت نہیں کر رہے ہیں، بلکہ پورے ملک کی خدمت کر رہے ہیں، اور اس طرح آپ تمام محبان وطن، جمہوریت پسندوں، ہندوستان کے سچے بہی خواہوں، اور تعلیم کی شرافت و عزت اور اسکی خودداری اور عزت پر عقیدہ رکھنے والوں کے شکریے کے مستحق ہیں، میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپنے بروقت خطرہ کا احساس کیا، اور ایک اہم اور عظیم مقصد کے لئے آپ یہاں جمع ہوئے ہیں، میری دعا ہے کہ خدا آپ کی صحیح رہنمائی فرمائے، اور آپ کی مدد کرے۔

ابوالحسن علی ندوی
دائرہ شاہ علم اللہؒ، رائے بریلی
۱۶ محرم الحرام ۱۳۹۳ھ - ۲۰ فروری ۱۹۷۳ء

تعمیر حیات کا
آئندہ شمارہ
"حلقۂ پیام انسانیت کنونشن نمبر"
ہوگا۔ جس میں ۲۰، ۲۱، ۲۲ مئی ۷۳ء کو دار العلوم ندوۃ العلماء میں منعقدہ "کل ہند حلقۂ پیام انسانیت" کے سہ روزہ کنونشن کی مفصل روداد، خطبۂ افتتاحیہ، تقاریر، مقالات، انسانی اور اخلاقی اقدار کے فروغ و نشوونما میں مفید منظوم کلام، تاریخ انسانی کی محسن شخصیتوں کا تذکرہ اور اس تحریک کے لائحہ عمل اور طریقۂ کار پر مشتمل رہنما مضامین ہوں گے۔
آج ہی اپنی کاپی محفوظ کرلیں۔
(منیجر تعمیر حیات)

بقیہ ص ۲: روداد حلقۂ پیام انسانیت سہ روزہ کنونشن

انہوں نے کہا کہ اشتہارات۔ پمفلٹ۔ تقریروں۔ جلسوں۔ سیمناروں سے زیادہ عملی کوشش کی ضرورت ہے۔ آپ کے بعد ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی نے تقریر کی، آپ نے فرمایا کہ پیام انسانیت کا تعلق ہر فرد اور ہر فرقہ سے ہے۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک اچھا ماحول اور بہتر و خوشگوار فضا پیدا ہو۔ نہ تو اسکے پس پردہ کوئی سیاسی غرض ہے اور نہ کسی اقتدار کی طمع"۔

ڈاکٹر صاحب کے بعد شری کے۔ بی۔ کول وائس چانسلر اگریکلچر یونیورسٹی کانپور نے اپنے خیالات و احساسات پیش کئے۔ آپ نے بتایا کہ انسان قدیم زمانہ میں شکاری جانوروں کی طرح تھا۔ پیغمبروں اور مہاتماؤں نے انھیں اپنی تعلیمات سے تمدنی زندگی سے روشناس کرایا۔ آپ نے عراق۔ موہن جوداڑو اور مختلف پرانی تہذیبوں کا ذکر بڑے ہی علمی انداز میں کیا۔ آپ کے بعد جناب عبدالکریم پاریکھ صاحب کی تقریر ہوئی اور پھر مولانا اسحٰق جلیس صاحب ندوی نے پیام انسانیت کے اغراض و مقاصد اور طریقۂ کار کا تذکرہ کیا اور چند ایسی زندہ مثالیں پیش کیں جن سے وہ خود بھی مختلف مرحلوں میں گزر رہے اور جن کا خود ان کو ذاتی تجربہ رہا ہے۔ آپ کی موثر اور بلیغ تقریر کے بعد حضرت مولانا مدظلہ کی اختتامی تقریر ہوئی اور یہ سہ روزہ پروگرام ختم ہوگیا۔

حالات ناسازگار، سخت گرمی سفر کی پریشانی، کنونشن کا اچانک اعلان اور بہت ساری مشکلات کے باوجود مندوبین کی تعداد [illegible] سے کسی طرح کم نہیں تھی، شہر لکھنؤ کے سربرآوردہ مسلم و غیر مسلم حضرات نے بھی بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور کیوں نہ ہو اس لئے کہ یہ لاکھوں انسانوں کے دل کی آواز اور ان کے دھڑکتے ہوئے ارمانوں کی ترجمان ہے۔ اس لئے کہ اس کا کوئی سیاسی مقصد یا ذاتی منفعت حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ خالص انسانی رشتے کی بنیاد پر انسانیت کے پلیٹ فارم سے آواز دینا ہے۔

بقیہ ص ۹: تربیت ائمہ مساجد کی ضرورت

ہو جانے کے بعد ہزاروں اہل خیر حضرات اس طرف توجہ فرمائیں گے اس عاجز سے بمبئی اور پونہ کے بعض دوستوں نے اپنی اس ذہنی اسکیم میں ہر طرح کے مسلسل تعاون کا یقین دلایا ہے جبکہ اسکیم عملی طور پر اب شروع ہوئی ہے۔ یہ کام ہمارے علاقے میں "مجلس تعلیم القرآن" شروع کر چکی ہے۔

(۱۲) مسلمانوں کی آبادی والے ہر قابل ذکر اوسط درجہ کے شہر میں اگر یہ اسکیم عملی طور پر شروع ہو جائے تو اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ جدید تعلیمیافتہ طبقے کو دینی پیشوائی آگے آنے کا راستہ کھلے گا۔ اور عربی تعلیم کے ماہرین کی زیر نگرانی یہ منزل طے کریگا۔ اس صورت میں پچاسوں قسم کے ملی منافع کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ مثلاً تعلیمیافتہ بیکاروں کے مسئلہ کا حل نکل آئے گا۔
۲۔ انگریزی اعلیٰ تعلیم کے فارغ طلبہ دینی راہ پر چلنے لگیں گے۔
۳۔ دس، بیس سال کی محنت اگر پورے ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں کی گئی تو ہزاروں کی تعداد میں انگریزی تعلیمیافتہ اصحاب کا گروہ دیہاتوں میں دینی اور ملی احیاء کے راستے پر کوشاں ہوگا۔
۴۔ دیہات اور قصبات کی اصلاح کی نئی نئی راہیں سامنے آئیں گی۔
۵۔ جدید انگریزی تعلیم اور علوم دینیہ کا حسین امتزاج ایک شخص میں ہو جانا ہمارے ملی وجود کے استحکام کا سبب بنے گا۔ یہ ایک ایسا طریقہ ہے جو قدیم و جدید کے فاصلوں کو کم کر دے گا۔ ایک "عین سلسبیل" ہوگا جو ایک طرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کی معیشت کو رواں کرے گا اور دوسری طرف ملت اسلامیہ کو دینی خطوط پر تعلیم لانے اور دینے کے لئے ذہنی یکجہتی فطری طور پر فراہم کرے گا۔

پرنٹر، پبلشر، مسئول سید محمد حسنی نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس سے طبع کرا کر دفتر تعمیر حیات ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔ ادیٹر: اسحٰق جلیس ندوی
کاتب و تزئین کار: جلال الدین بستوی ندوی

تربیتِ ائمہ مساجد کی ضرورت

از: عبدالکریم پاریکھ۔ ناگپور

★

"فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون" ۰
(التوبہ-۱۲۲)

(ایسا کیوں نہیں کرتے کہ آبادی کے فرقے میں سے کچھ لوگ نکل آتے اور دین میں سمجھ حاصل کرکے واپس جاکر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ بھی غلط راہ سے پرہیز کرتے)۔

دینی تعلیم کا مقصد اور طریقۂ کار اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خود ہی مقرر فرما دیا ہے۔ ہر شہر، قریہ و بستی میں رہنے والے مسلمانوں کے ہر قبیلے ہر طبقے اور ہر فرقے میں سے کچھ افراد دین میں سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے لئے مرکزوں میں تعلیم دین حاصل کرنے کی غرض سے آئیں اور ضروری تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے بعد اپنے اپنے علاقوں میں واپس جاکر وہاں کے باشندوں میں دینی شعور اور بیداری پھیلانے کی بھرپور کوشش کرتے رہیں کہ تمام آبادیوں میں حدود اللہ کی معلومات خوب اچھی طرح ہو جائے، تاکہ ہر شخص اللہ کی نافرمانی سے ڈرنے لگے۔

دینی تعلیم کے نظام کا مقصد اور طریقۂ کار متعین کرتے وقت اس آیت کریمہ کو سامنے رکھنا ضروری ہے اس لئے اول یہ فرمانِ خداوندی آپ کے سامنے رکھ دیا گیا۔ اب آگے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جو قوم صرف اپنے مسائل کا رونا روتی ہے اور اس کا کوئی حل تلاش کرکے مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی عملی جدوجہد نہیں کرتی، دینی اعتبار سے اس کی ہلاکت یقینی ہے۔ مسلمانانِ ہند چونکہ اپنا تعلق دینِ اسلام کے ساتھ وابستہ رکھے ہوئے ہیں۔ اس لئے من حیث الملت وہ ابتک مٹائے نہیں جاسکے اور تاقیامت انشاءاللہ ان کا وجود اس سرزمین پر باقی رہے گا۔

لیکن چاہنگ ملّی اور قومی پریشانیوں کا تعلق ہے وہ دن بدن بڑھتی ہی جارہی ہیں اور ہمارے سامنے ان گنت مسائل ہیں جن کا حل اس امّت کو درکار ہے۔ ان میں ایک مسئلہ ہے دینی تعلیم کا جس کی نوعیت قرآنی طرز کی ہو۔ اور ایک مسئلہ ہے انگریزی تعلیم یافتہ بیکاروں کا۔ اگر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ملّتِ اسلامی کے مسائل کو حل کرنا آپ کی ذمہ داری ہے، اس ملّت کا دُکھ درد آپ کے دل کی چبھن ہے، اس کا مٹنا آپ کا مٹنا ہے، اس کا جینا آپ کا جینا ہے اس کا باعزت وجود آپ کا وجود ہے تو میری ان بے ترتیب معروضات پر غور فرمائیے۔ اور خدا کا نام لے کر کچھ عملی اقدام کر ڈالئے۔

آپ کی ملّی ہمدردی اور دینی غیرت و حمیت کو اپیل کرنے کے بعد موجودہ حالات میں علم دین کے متعلق ہماری قومی لاپرواہی اور اعلیٰ انگریزی تعلیم کے نفع و نقصان کو سامنے رکھ کر ایک ملی جلی اور دادِ تُنا دینا ضروری ہے بہت سے اہل علم بھی برا مان جائیں گے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب بھی ناراض ہونگے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم نے اپنے ہونہار اور چالاک بیٹوں کو اعلیٰ انگریزی تعلیم کے لئے کالج اور یونیورسٹیوں میں داخل کرایا کہ یہ اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے کے لائق ہیں ان کو ایسی تعلیم دلائی جائے کہ یہ افسری، رہنمائی اور حکمرانی کرسکیں۔

کھاتے پیتے اور صاحب مال گھرانوں کی طرف سے ڈھیروں مال ان کی تعلیم اور رہن سہن پر خرچ کیا گیا۔ ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد جن کی قسمت میں تھا تو تحصیلدار، کلکٹر، منسٹر، لیڈر، ریڈر بہت کچھ بن گئے ورنہ تقدیر کے چکر کے جو شکار ہوئے تو کلرکی سے بھی محروم رہے۔ بلکہ اس دور میں تو چپراسی PEON کی نوکری بھی ملنی مشکل ہوئی، اور سیکڑوں ہزاروں مسلمان نوجوان اعلیٰ سند حاصل کرنے کے بعد رکشا تک چلانے لگے۔ آخر پیٹ بھرنے کا کچھ نہ کچھ انتظام تو کرنا ہی تھا یہ حال ہوا ان لوگوں کا جو سوسائٹی کا مکھن CREAM OF SOCIETY سمجھے جاتے ہیں۔

اس کے بالمقابل ہمارے خوشحال طبقے کی اولاد میں جو اپاہج اور ناکارہ تھے یا بلید الذہن تھے ہمارے بعض امراء نے انہیں دینی مدارس میں داخل کرایا کہ دنیا کی امامت و سرداری کے لائق جو نہیں تھے ان کو دینی پیشواؤں کے حوالے کیا جائے۔ یا اگر ہمارے بعض لختِ جگر ذہین تھے، صاحب صلاحیت تھے بہت ہوشیار تھے مگر چونکہ ہم خود خستہ حال تھے، اپنا پیٹ بمشکل بھر سکتے تھے اور اپنی اولاد کو انگریزی اسکولوں میں خرچیلی تعلیم دلانے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ بس اپنی معاشی حالت سے مجبور ہو کر ہم نے اپنے ان بیٹوں کو دینی مدارس میں داخل کرایا تاکہ علمائے کرام خود ہی ان کی تعلیم و تربیت غذا اور لباس کا انتظام کریں۔

اس دین کو روزِ اول سے ابتک غرباء کی طرف سے بڑا تعاون ملا ہے۔ بس بیچارہ یہ مخلص اور بے وسیلہ طبقہ اپنی اولاد کو چاہے چالاک ہو یا بدھو جیسی بھی ہو دین کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھانے کے لئے ہمیشہ تیار رہا۔ اور اسی طبقے سے تعلق رکھنے والے ابناءِ ملت کی بڑی تعداد مسندِ رسولؐ پر جلوہ افروز ہوتی رہی۔

ان حالات اور ان صلاحیتوں کے لوگوں کا دینی مدارس میں ہمیشہ سے اجتماع رہا، لیکن رحمتِ عالم کے دربار سے کوئی نامراد نہیں لوٹا کرتا۔ بس دنیائے فانی کے معیار سے جو لوگ رد کر دئے گئے تھے اور جن کو پتھر، کنکر کی طرح بے قیمت جان کر دینی مدارس کی نذر کیا گیا تھا وہ ہیرے جواہرات اور لعل و یاقوت سے بھی زیادہ قیمتی نکلے۔

ایھا المسلمون! یہ خارکمال نہیں تھا یہ کمال تھا قرآن مجید کا، یہ احادیث نبویہ کا کمال تھا، یہ ان بزرگوں کی محنت کا ثمرہ تھا جو مسندِ رسولؐ پر بیٹھ کر سنگریزوں کو ہیروں میں تبدیل کر دیا کرتے تھے۔ ترنے بجھی ہوئی قندیلیں دین کی جائے پناہ میں لا چھوڑی تھیں، مگر ان میں ہر ایک کو روشنی ایسی ملی کہ ہر قندیل قندیلِ رحمانی بن گئی۔ نورٌ علیٰ نور۔

ہاں استثناءات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بہت سے مالداروں کے سپوت بھی دینی مدارس میں بھیجے گئے ہیں۔ اور کافی ذی فہم سلیم الطبع اصحاب کی تعداد بھی مسندِ رسولؐ کے سامنے دو زانو بیٹھی ہے۔ لیکن دینی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے والوں کی اکثریت بہرحال ان لوگوں کی رہی، جن کی تعلیم کے اخراجات کا مالی بوجھ ہم برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ علمی مرکزوں کے منتظمین اور بیچارے علماءِ حق قریہ قریہ گھوم پھر کر آنہ، پیسہ مانگ کر لائے کہ رسول اللہ کے مکتب کے طالب علم کے لئے روکھی سوکھی روٹی کا انتظام تو ہو جائے۔ اور بڑی کفایت شعاری سے کتب و لباس نیز دارالاقامہ تک کا انتظام بھی کچھ اسی طرح کرتے رہے۔ اور اب بھی کئے جا رہے ہیں۔

یہاں بھی ہمارے نوابوں، راجوں، مہاراجوں، شیخوں اور شاہوں کا پیسہ بہت تھوڑا لگا۔ طالب علم بھی اکثریت کے لحاظ سے غرباء تھے اور دینی مدارس کی مالی کفالت کرنے والے بھی بڑی حد تک غرباء اور اوسط درجے کے لوگ ہی رہے۔

سکاش! اس امّت نے دورِ ماضی میں اپنے خوشحال اور صاحبِ صلاحیت افراد کو دینی مدارس میں بھیجا ہوتا اور مسلم سرمایہ دار، نواب، جاگیردار اور سیاسی لیڈر اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے مرکزوں میں بھرتی کرانے کے لئے قطاریں QUEUE لگاتے اور دینی درسگاہوں کی کفالت اپنے ذمے لیتے تو یہ اُمّت آج کے دور میں رہنمائی کے لئے دو خیموں پر نظر نہ ڈالتی بلکہ اسے اپنے پیشوا ایک ہی کیمپ میں مل جاتے۔

اس مختصر رُوداد کو سن کر اگر آپ کی دینی بیداری کے تار جھنجھنا اٹھے ہیں تو ان دونوں طبقوں کو ایک خیمے CAMP میں لانے کی کوشش کیجئے۔ دونوں کے تعلیمی، اقتصادی، معاشی مسائل کا ایک سادہ حل تلاش کیجئے، اور شور مچانے کی بجائے خاموشی سے ایک کام شروع کیجئے، جس کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ کی خدمت میں ان صفحات پر پیش کیا جا رہا ہے۔

دورِ حاضر میں ایک چپراسی کی نوکری کے لئے گریجویٹ نوجوان کی قطاریں ملک کے طول و عرض میں دکھائی دیتی ہیں۔ پھر بیچارہ مسلمان نوجوان بی۔ اے، ایم۔ اے، بی کام اور ایم کام کرنے کے بعد جب قطاروں میں کھڑا کھڑا مایوس ہو کر لوٹتا ہے تو اُسے کچھ سُجھائی نہیں دیتا کہ وہ کیا کرے؟ ملک کے مختلف علاقوں میں اس خادم سے ایسے سیکڑوں مسلم نوجوانوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں جو اعلیٰ انگریزی تعلیم کے بعد کسی طرح کی نوکری پانے میں ناکام رہے لیکن اب وہ قلی اور حمال کی لائن پر کام کرنے اور اپنی ساری سابقہ تعلیمی صلاحیتوں کو ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کو آمادہ نظر آتے ہیں۔ لیکن چونکہ اپنی تعلیم کے دوران میں یہ نوجوان

جس طرح کی زندگی گذار کر نکلتے ہیں وہ ہر قدم پر ان کا مقابلہ کرتی ہے۔ اور ان کو کسی بھی معاشی محنت میں کھڑا نہیں رہنے دیتی۔ اس لئے ان میں سے جذباتی نوجوان خودکشی کی طرف یا پھر جرائم کی طرف آمادہ نظر آتے ہیں۔ پھر یہ طبقہ کہاں جائے اور کیا کرے؟ یوں کہئے کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں اور حقیقت بھی ہے کہ مسلمانوں کو سرکاری نوکریوں میں ان کا اپنا حصہ نہیں مل پاتا لیکن اگر مل جائے تو کیا یہ مسئلہ پھر بھی حل ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔

میرے خیال میں ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان کو جو نوکریاں حاصل کرنے میں ناکام ہو چکے ہوں ان کے مسائل کو حسبِ ذیل طریقے پر حل کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ تربیت ائمہ مساجد:

اعلیٰ تعلیم یافتہ گریجویٹ نوجوانوں میں سے بیکار اصحاب کو جو باصلاحیت ہوں انتخاب کرکے انہیں "تربیت ائمہ مساجد" کی اسکیم کے تحت حسبِ ذیل طریقہ پر سہل الحصول دینی تعلیم مع چند صنعتی کاموں کے آراستہ کرکے ہندوستان کے لاکھوں قصبوں، دیہاتوں کی مساجد میں مقرر کیا جاسکتا ہے۔

(۲) بڑے بڑے شہروں میں ابتداءً تجرباتی طور پر چار پانچ نوجوانوں کا انتخاب کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ دو سال اور کم از کم ایک سال میں ان کی تعلیم مکمل کر دی جائے۔ دورانِ تعلیم ہر طالب کو ۵۰ سے لے کر سو روپے تک ماہانہ وظیفہ دیا جائے۔ ابتدا میں صرف مقامی لوگوں تک ہی کام کو محدود رکھا جائے، تاکہ دارالاقامہ کی ضرورت تجرباتی دَور میں نہ رہے۔

(۳) تعلیم کے دَوران ان نوجوان گریجویٹ اصحاب کو اوّل انفرادی نماز کی تصحیح، قرآن مجید کا رواں مطالعہ مع ترجمہ، بعد ازاں نماز باجماعت کے مسائل، جمعہ و عیدین کی نمازیں، نماز جنازہ اور خطبۂ نکاح وغیرہ کی ضروری معلومات کرادی جائے پہلے مسائل بھی ضروری حد تک پڑھا دئے جائیں اور یہ تربیت کسی بھی شہر کے مقامی عربی مدرسے میں واجبی خرچ دے کر آسانی سے کرائی جاسکتی ہے۔

(۴) گاؤں اور قصبوں میں ہزاروں مساجد ایسی ہیں جہاں کسی پیش امام کا تقرر اب مشکل ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ ایک طرف شہری زندگی سے لگاؤ اور دوسری طرف قصبوں اور دیہاتوں میں لوگوں کا قابل قدر علماء وائمۂ مساجد کی تنخواہ کا بار نہ اٹھاسکنا بھی ہے۔ ہندوستان میں سات لاکھ دیہات ہیں ان سات لاکھ دیہاتوں میں کم از کم آدھی تعداد مساجد کی یا تو بند ہیں اور اگر کھلی بھی ہیں تو وہاں کسی پیش امام کا تقرر نہیں۔ دیہات اور گاؤں میں کہیں تو پانچ، دس یا پچیس ۲۵ ۔ ۵۰ مسلمانوں کے گھر ہیں۔ ان مسلمانوں کی دینی تعلیم اور خود بڑی عمر کے لوگوں کا مذہب سے لگاؤ نہیں کے برابر ہونے کا سبب ائمہ مساجد کی کمی کو بجا طور پر قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر اس اسکیم کے تحت گریجویٹ اصحاب کو وہاں جانے کے لئے تیار کر دیا جائے تو یہ ایک مفید کام ہوگا۔

(۵) دیہاتی لوگ زیادہ سے زیادہ پچاس یا سو روپے ماہانہ بمشکل کسی پیش امام کو دے سکتے ہیں جو امامت بھی کرے اور صبح و شام مسلمان بچوں کو ناظرۂ قرآن شریف و دیگر دینی ضروریات سے واقف کرا دے۔ اس صورت میں ائمہ مساجد کے تحت جو لوگ تیار ہوں، انہیں دیہاتوں اور قصبوں میں ۵۰ تا ۱۰۰ روپیہ ماہانہ گاؤں کے لوگوں پر ڈال کر جسے وہ بخوشی دینے کو راضی ہوں باقی ۵۰ تا سو روپیہ ماہانہ شہر کے لوگ جو تربیت ائمہ مساجد کا پروگرام جاری کریں وہ ادا کریں اس طرح ایک سو تا دو سو روپیہ ماہانہ کا انتظام ہوسکتا ہے۔ باقی سو پچاس روپیہ ماہانہ کی آمدنی خیاطی، گھڑی سازی اور جلد سازی کے کام سے شخص متعلق کرے تو یہ بھی عین ممکن ہے۔

(۶) ہر طالب علم کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ امامت میں ہرج نہ ہو ایسے چند کام بھی سکھا دئے جائیں مثلاً خیاطی (درزی) کا کام، جس کے تحت تھیلیاں سینا، چھوٹے چھوٹے کپڑے، بچوں اور بڑوں کے قمیص پاجامے وغیرہ سینا سکھا دئے جائیں اور ہو سکے تو ہر طالب علم کو تعلیم مکمل ہونے کے بعد ادارہ ایک سلائی مشین بھی ساتھ کرے اس کے علاوہ گھڑی کی درستگی کے مختصر اوزار بھی ساتھ کر دئے جائیں تاکہ دیہاتوں میں گھڑی کی ریپیرنگ بھی وہ کرسکے۔ اس طرح سے اس پیش امام کا دسترخوان بھی وسیع ہوسکتا ہے اور دینی خدمتگاروں کی خوشحالی بھی ایک درجے میں جتنی ضروری ہے ہو سکتی ہے۔

(۷) **طریقۂ تعلیم**: طریقۂ تعلیم نہایت ہی سہل اور آسان ہو۔ ابتدائی تعلیم کے بعد طالب علم درمیانی درجہ کا مقرر اور مدرس بن سکے تاکہ دیہاتی عوام کو دین کی حقیقی تعلیم سے روشناس کراسکے ترجمہ کے ساتھ ساتھ ابتدائی عربی زبان صرف اتنی کرادی کہ قرآن مجید کو سمجھ سکے اور یہ تعلیم گریجویٹ ذہین اصحاب کو ظاہر ہے کہ بہت کم وقت میں دی جاسکتی ہے۔ مسائل میں جائز و ناجائز میں اعتدال کا پہلو طالب علم کے ذہن پر نقش کر دیا جائے۔ تاکہ بعض قصبوں میں شدت و ہابی کی جو وبائیں پھوٹ پڑتی ہیں اس کی اصلاح ہوسکے ساتھ ہی ساتھ یہ پیش امام اپنے علاقے میں مسلمانوں کی دینی اور اقتصادی حالت کا اچھی طرح جائزہ لیکر کام کرسکے اس کی اسے عملی تربیت دی جائے کہ وہ دیہاتوں میں مسلمانوں کی پیدائش و اموات کے اندراجات کرتا رہے، نیز اپنے حلقۂ اثر میں تعاون و محبت اور خیر خواہی کا ماحول بنا کر مسلمانوں میں اجتماعی زندگی کا شعور پیدا کر سکے۔

(۸) فارغ طلبہ کے لئے کسی مدرسے کی سند کا اہم سوال باقی رہتا ہے اسے حل کرنے کی مختلف تدابیر کیجاسکتی ہیں۔ اول تو یہ کہ دیہاتوں میں اس طرح کا مطالبہ شاید ہی اٹھا دِکھا مقامات پر ہوتا ہے کہ پیش امام کو کہیں کا سند یافتہ ہونا چاہئے ورنہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ نہایت ہی کم فہم قسم کے بیچارے بعض اصحاب قصبوں اور دیہاتوں میں امامت کا فریضہ انجام دیتے ہیں جنہیں قرآن مجید تک صحیح پڑھنا نہیں آتا۔ البتہ داڑھی اگر کسی نے اچھی خاصی رکھ لی تو وہ پیش امام ہونے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں اندرونی علاقوں میں یوں بھی کوئی صاحبِ علم جانے کو تیار بھی کب ہوتے ہیں کہ دیہات میں سند یافتہ عالموں کی مانگ ہو۔ اور کہیں یہ مانگ ہے بھی تو تنخواہ کے مصارف سند یافتہ علمائے کرام کے معیار کے مطابق دیہی علاقے متحمل نہیں ہوسکتے۔

لہٰذا یہ ثابت شدہ بات ہے کہ فی الوقت باقاعدہ سند کی ضرورت نہیں البتہ سند ہونا ایک اچھی بات ہے اس لئے مختلف مدارس سے سند لی جاسکتی ہے۔ اور یہ کام بخوبی انجام دیا جانا ممکن ہے البتہ اس ضمن میں دیوبندی، بریلوی جھگڑوں سے دور ایک الگ تھلگ کمیٹی فکر ہو تو اچھا ہے۔ میرے خیال میں ندوۃ العلماء کی سند اس کام میں مفید ہوسکتی ہے یا پھر کوئی مقامی اصلاحی مدرسے سے بھی یہ کام لیا جاسکتا ہے۔ ایک بہتر صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ مقامی ادارہ جو تربیت ائمہ مساجد کا کام شروع کرے وہ خود سند یافتہ علمائے کرام کو اپنے یہاں مقرر کرے اور ان کی سند سے کام چلاتا رہے۔

(۹) **مصارف کا تخمینہ**:

اگر ابتدائی طور پر صرف چار نوجوانوں پر یہ تجربہ کیا جائے تو بہتر ہوگا۔

اول چار اصحاب کو ماہانہ وظیفہ	/۱۰۰ روپے
تربیت کا کام انجام دینے والے معلم کی تنخواہ	/۲۰۰ "
کتب و رسیات و دیگر متفرق	/۲۰۰ "
ایک نگراں، ماہر تعلیم بحیثیت ناظم	/۲۰ "
تربیت کیلئے مقرر شدہ مکان کا کرایہ	/۱۰۰ "
میزان	/۸۰۰ "

یعنی سالانہ نو ہزار چھ سو روپے ۹۶۰۰۔

رہا سوال دیگر صنعتی علوم کی تعلیم تو اس کی تفصیل ذیل میں دی جا رہی ہے خیاطی کے لئے کسی مقامی مسلم ٹیلرنگ شاپ میں طلبہ کو روزانہ ایک گھنٹہ کی تربیت ہو۔ ابتداءً وہ صرف دیکھتا رہے کہ یہ کام کس طرح ہوتا ہے۔ بعد میں چھوٹے کپڑوں پر اسے مشق کرا دی جائے۔ ہمارے علاقے میں اس کام کے لئے کچھ بھی خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔ کئی اصحاب نے اپنی طرف سے تعاون کی پیش کش اس اسکیم کے بروئے کار آنے سے قبل ہی کر دی ہے۔

گھڑی سازی کا کام بھی اسی طرح سکھایا جائے کہ مقامی واچ میکر مسلمان دوکانداروں کے یہاں ایک ایک فرد کو ایک گھنٹہ روزانہ بیٹھنے کی پابندی عائد کر دی جائے۔ مقامی لوگ اس کام میں حبِ ملت اور ضرورتِ دینی کا لحاظ کرتے ہوئے انشاءاللہ خوشی خوشی معاون بن جائیں گے۔ اسی طرح جلد سازی وغیرہ کی بھی عملی مشق کرائی جاسکتی ہے جس کے لئے طلبہ مقامی کاریگروں کے یہاں وقت کی پابندی کے لحاظ سے تقسیم کر دئے جائیں گے۔

(۱۰) البتہ ایک سال میں تربیت مکمل ہونے پر ان چاروں طالب علم دوستوں کو ایک ایک سلائی مشین دی جائے تو پندرہ سو سے دو ہزار کا خرچ مزید ہوگا۔ اس طرح سے ایک سال کا تخمینہ گیارہ ہزار ہوگا جو چار جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ائمہ مساجد کی تربیت دینے کے لئے کم از کم درکار ہے۔

(۱۱) اوسط درجے کے کسی شہر میں اتنی چھوٹی سی رقم کوئی مشکل کام نہیں بلکہ آگے ان چاروں اصحاب کے لئے پچاس روپیہ ماہوار کا خرچ اور کرنا ہوگا جو سالانہ (۲۴۰۰) ہوگا۔ لیکن میرے خیال میں عملی طور پر کامیابی حاصل

(بقیہ صفحہ ... پر)

مدینۃ العلوم

مالابار

ایک عظیم اسلامی درسگاہ

پروفیسر سید احتشام ندوی۔ صدر شعبۂ عربی
کالی کٹ یونیورسٹی۔ کیرالہ

مدینۃ العلوم مالابار کا ایک نہایت اہم مدرسہ ہے جس میں عربی علوم وفنون کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے۔ ہر سال بڑی تعداد میں طلبہ علوم اسلامیہ کی تعلیم حاصل کر کے فارغ التحصیل ہوتے ہیں۔ یہ دار العلوم ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع ہے اس لئے علم کی بلندی اور دلکشی کا احساس یہاں پہونچ کر اور بڑھ جاتا ہے۔ یہاں لائق اساتذہ کی زیر تربیت طلبہ علوم اسلامیہ میں نظری وعملی حیثیت سے امتیاز حاصل کرتے ہیں یہاں کے فارغ التحصیل علماء اس دیار میں ستاروں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں اور علم وعمل کا مرجع بنے ہوئے ہیں۔

یہ دار العلوم کالی کٹ شہر سے صرف چند میل کی دوری پر واقع ہے چند ماہ قبل مدینۃ العلوم کے پرنسپل یا مہتمم صاحب نے یہاں کے طلبہ کی انجمن کے افتتاح کے لئے مجھے مدعو کیا تھا۔ اس موقع پر اس درسگاہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ خاص طور سے طلبہ اور اساتذہ سے گفتگو کرنے اور ان کی تعلیمی وعلمی زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کا سنہرا موقع ہاتھ آیا۔ چنانچہ پورا دن وہاں گذرا۔ اس دیار کے مشہور عالم دین شیخ محمد مولوی صاحب بھی جلسہ میں تشریف لائے۔ مولوی صاحب یہاں جمعیۃ العلماء اہل حدیث کے صدر ہیں اور عربی زبان پر غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے نہایت فصیح عربی میں تقریر فرمائی۔ میں نے بھی عربی میں تقریر کی طلبہ نے عربی میں نظمیں پڑھیں۔

مدینۃ العلوم میں پہونچ کر محسوس ہوا کہ واقعی یہ مدینۃ العلوم ہے جہاں طلبہ، اساتذہ اور تمام لوگوں سے عربی میں گفتگو کا موقع ہے اور ایک اسلامی ماحول ہے کسی نے کہا تھا کہ:
"وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے"
لیکن نہیں ایسی دوکانیں آج بھی موجود ہیں،
جہاں دوائے دل بکتی ہے۔ یہ مبارک مدرسہ بڑی عظمت کا مستحق ہے۔ اس آستانے سے طلبہ بڑی تعداد میں علم وعمل کی دولت حاصل کر رہے ہیں اور برسہا برس سے اس کا فیض عام ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ مدرسہ ۲۵ برس سے قائم ہے۔ اس میں ۲۵۰ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ مدرسہ کی عمارتیں ایک احاطہ میں ہیں، عمارتیں سب کھپریل کی ہیں۔ اس کی وجہ عام طور سے یہ ہے کہ مالابار میں بارش بڑی زبردست ہوتی ہے اسی بنا پر اکثر عمارتیں کھپریل پر مشتمل ہوتی ہیں۔ مدرسہ کے احاطہ میں ایک شاندار مسجد ہے۔ طلبہ کے لئے ایک کھیل کا چھوٹا سا میدان ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جگہ مدرسہ کی عظمت ووسعت کے لحاظ سے اور وسیع ہونی چاہیے تھی مگر پہاڑ کی چوٹی پر اس سے زیادہ کا امکان ہے نہیں (مدرسہ) کے پاس ایک وسیع قطعہ اراضی ہے جس کو ابو حاجی صاحب نے وقف کیا ہے مگر یہ مدرسہ سے ۲۰ میل دور ہے۔

یہاں عربی مدرسہ کے ساتھ عموماً ایک یتیم خانہ بھی ہوتا ہے چنانچہ...... مدینۃ العلوم میں بھی یتیم خانہ قائم ہے مالابار میں حفظ کے مدارس بہت کم ہیں۔ رمضان میں مساجد میں ختم قرآن کا رواج بھی کم ہے مگر اس کے بجائے عربی زبان کی تعلیم کا رواج عام ہے۔ فنی طور پر قرات کا رواج بھی یہاں نہیں ہے مگر تلفظ عربی الفاظ کا صحیح ہے خصوصاً ع اور ض نہایت صحیح مخارج سے لوگ ادا کرتے ہیں۔

جلسہ کے بعد میں کتب خانہ گیا۔ یہاں کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے ۱۰ ہزار عربی کتابیں موجود ہیں۔ میں نے کتب خانہ میں کافی وقت صرف کیا اور خوش قسمتی سے ایک نہایت عمدہ کتاب ہاتھ آگئی "صفحات عن تاریخ اسلام وانڈونیشیا" انڈونیشیا کے مسلمانوں کے بارے میں مواد کی مجھے بہت دنوں سے تلاش تھی۔ شکر ہے کہ یہ عمدہ کتاب مل گئی جس سے میرے کام میں مجھے آسانی ہوئی۔

مدرسہ میں سات اساتذہ ہیں۔ ان کے نام اس بنا پر لکھ رہا ہوں کہ بے لوث اور مخلص خدمت کرنے والوں کے نام عام ہوں اگرچہ یہ بزرگ نام کے قائل نہیں، قلیل مشاہرے پر اسلام اور عربی کی خدمت میں مصروف ہیں۔

۱۔ کے۔ سی۔ سیدر علوی مولوی
۲۔ پی۔ پی عبد الغفور
۳۔ کنجی احمد مولوی
۴۔ کے این ابراہیم مولوی پرنسپل
۵۔ پ۔ ن محمد مولوی
۶۔ م۔ س۔ س حسن مولوی
۷۔ علی کٹی مولوی
۸۔ کنج جمہ مولوی
۹۔ محی الدین کٹی مولوی
۱۰۔ عبد الرحمٰن مولوی

طلبہ، اساتذہ اور اہل علم سے ملکر دل کو ایک روحانی مسرت حاصل ہوئی۔ یہ حقیقت ہے کہ مدینۃ العلوم نے بڑی تعداد میں علماء پیدا کئے ہیں اور ان کا فیض اس دیار میں عام ہے۔ اس مدرسہ کا تعلیمی معیار بلند ہے طلبہ ذی استعداد ہیں اور ان کی اخلاقی ودینی تربیت پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔

مدرسہ کے مہتمم جناب پی۔ کے ابراہیم مولوی صاحب نہایت مخلص بزرگ ہیں ان کی محبت اور خلوص سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا اور اس عظیم اسلامی درسگاہ کو دیکھ کر آنکھوں میں نور اور دل میں سرور محسوس ہوا، اس دور میں جب کہ نفسی نفسی کا عالم ہے اتنی بڑی دینی تعلیمی خدمت انجام دینا بڑا کمال ہے مبارک ہیں وہ صاحب عزم جنھوں نے اتنی بڑی خدمت انجام دی ؂

اک چراغ است دریں خانہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند

مدرسہ میں ۶ برس کی تعلیم ہے پہلے دو برس ابتدائی صرف ونحو زبان طلبا کو پڑھائی جاتی ہے، پھر افضل العلماء کا اصل کورس حصہ اول شروع ہوتا ہے جو دو برس کا ہے پھر حصہ دوم کا کورس دو برس کا ہے۔

یہ واضح رہے کہ یہ نصاب کالی کٹ یونیورسٹی کا ہے اور مدرسہ گورنمنٹ تسلیم کرتی ہے اور اساتذہ کو تنخواہ بھی دیتی ہے یہ عربی کالج کہلاتے ہیں۔ ایسے چھ یا سات مالابار میں ہیں جو باعث فیضان رحمت ہیں۔ افضل العلماء کا ذریعہ تعلیم صرف عربی ہے اسی بنا پر طلبہ کے اندر عربی لکھنے اور بولنے کی اچھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ آسانی سے عربی میں گفتگو کر سکتے ہیں۔

اس مدرسہ پر ایک مخیر بزرگ نے اپنی جائداد کا بڑا حصہ وقف کر دیا ہے، میری تقریر سننے کے لئے وہ بھی تشریف لائے ان کی دید سے میری نگاہیں شاد ہوئیں۔ ان کا نام ہے ابو حاجی۔ ابو غالباً احمد کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

یہ مدرسہ یہاں کی جماعت اہلحدیث چلاتی ہے جو "ندوۃ المجاہدین" کے نام سے معروف ہے۔ ندوۃ المجاہدین کے اور بھی کئی عربی مدرسے ہیں۔

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مالابار میں مسلمان تعلیمی لحاظ سے بہت پست تھے۔ حتی کہ عربی تعلیم کے لئے بھی یہاں اعلیٰ سطح پر کوئی مدرسہ نہ تھا بلکہ علماء متوسطات تک علوم اسلامیہ حاصل کر کے تکمیل کے لئے باقیات الصالحات ویلور یا پھر دار العلوم دیوبند جاتے تھے جب ندوۃ المجاہدین کے زیر اہتمام یہ عربی مدرسے کھل گئے اور ان میں افضل العلماء کا نصاب پڑھایا جانے لگا تو گویا اعلیٰ سطح پر علوم عربیہ کا انتظام ہو گیا۔ چونکہ افضل العلماء کی ڈگری تسلیم شدہ ہے اور پرائمری اسکول میں یا ہائی اسکول میں ان سند یافتہ لوگوں کو فوراً ملازمت مل جاتی ہے اسی بنا پر یہ لوگ عربی کی مزید تعلیم حاصل نہیں کرتے۔ امسال ایک نیا کورس تجویز کیا گیا ہے جو عربی ادب یا کسی اسلامی موضوع کے متعلق تخصص پر مبنی ہوگا۔ مدینۃ العلوم ان مدرسوں میں غالباً سب سے بڑا ہے جو افضل العلماء کا کورس پڑھانے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس دیار میں اس طرز کے ۵ مدرسے اور ہیں۔

(۱) سلم السلام عربی کالج (۲) انصار عربک کالج (۳) انوار الاسلام عربک کالج (۴) روضۃ العلوم عربک کالج (۵) دار العلوم عربک کالج۔ یہ اورینٹل کالج یا عربک کالج کہلاتے ہیں۔

یہ واضح رہے کہ مسلمانوں کے وہ عربی مدرسے جو حکومت سے مدد نہیں لیتے وہ الگ ہیں اس لئے کہ مذکورہ عربی کالجوں کے اساتذہ کو حکومت سے گرانٹ ملتی ہے۔ خود ندوۃ المجاہدین (اہلحدیث) کے ایسے مدارس ہیں جو حکومت سے گرانٹ نہیں لیتے اور نہ افضل العلماء کا کورس پڑھاتے ہیں۔ ان میں وہ مشہور مدرسہ بھی ہے جو "جامعہ ندویہ" کے نام سے "اڈونا" میں قائم ہے۔

مولوی شیخ محمد صاحب نے بتایا کہ اس دیار میں بدعت اور شرک سے اجتناب کے لئے یہ مدرسہ مدینۃ العلوم قائم کیا گیا اور اس میں نہ صرف تعلیم ہوتی ہے بلکہ خالص اخلاقی واسلامی تربیت کا بھی نظم ہے۔

ندوہ کے شب و روز

شعیب اسلم حیدرآبادی متعلم ندوہ

ندوہ سے خصوصی اور قریبی تعلق رکھنے والے سعودی عرب کے سابق سفیر متعینہ ہند شیخ یوسف الفوزان ایک طویل علالت کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے عصر کے وقت اطلاع پہونچی اور فوراً ہی تعزیتی جلسہ کا اعلان کر دیا گیا۔ اتفاق سے حضرت مولانا موجود تھے۔ آپ نے اس جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس جلسہ کے انعقاد کا مقصد مرحوم کے حق میں چند کلمات خیر کہہ کر ان کی روح کو ثواب پہونچانا اور جو لوگ مرحوم سے واقف نہیں ہیں ان کو مرحوم کے محاسن سے مطلع کرنا ہے۔

مولانا مدظلہ، نے مرحوم سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ۱۹۴۹ء یا ۱۹۵۰ء سے مرحوم سے میرے تعلقات تھے۔ مرحوم ندوہ سے مخلصانہ شفقانہ اور بزرگانہ تعلقات رکھتے تھے۔ مملکت سعودیہ میں ندوہ کو روشناس کرانے کی اولیں کوشش مرحوم شیخ یوسف الفوزان ہی کی تھی۔ مرحوم کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو اسلامی حمیت تھا مرحوم اسلام کے خلاف کسی ادنیٰ سی حرکت کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔

آخر میں مولانا نے پُر درد و دلسوز الفاظ میں دعائے مغفرت کی۔

آیئے ہم بھی بارگاہ خداوندی میں ہاتھ پھیلائیں، خدایا اس مرد مومن کو بلند سے بلند درجات عطا فرما۔ آمین

انجمن النادی العربی جو طلبہ میں عربی استعداد پیدا کرنے کے لئے قائم ہوئی ہے، طلبہ ہی کے زیر انتظام بحسن وخوبی اپنے کام طے کر رہی ہے۔

ہفتہ میں ایک بار اپنے عربی اجتماعات منعقد کرتی ہے اور طلبہ کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے لئے کبھی کبھی انعامی مقابلے بھی کرواتی ہے اس سال اس کا پہلا انعامی مقابلہ ۶ر جمادی الاولیٰ بروز جمعرات منعقد ہوا بہت سے طلبہ نے حصہ لیا۔

مندرجہ ذیل طلبہ انعام کے مستحق قرار دیئے گئے۔ یہ مقابلہ درجہ پنجم اور ششم کے درمیان تھا۔

انعام اول	محمد نعمان الدین	ششم عربی
〃 دوم	محمد ندیم صدیقی	〃 〃
〃 سوم	امام الہدیٰ	پنجم عربی

ندوہ کے طلبہ میں تحریری و تقریری ذوق اور عربی مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کے لئے اس انجمن نے بڑا کام کیا ہے ہر ہفتہ اس کے جلسے ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار مقابلے اور مباحثے بھی منعقد ہوتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں مقابلہ ہوا تھا اور اب مختلف درجات میں مختلف موضوعات پر مباحثے ہو رہے ہیں اس ہفتہ میرے درجہ (ششم عربی) میں مباحثہ تھا، موضوع تھا "اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلا یا اخلاق حمیدہ کے ذریعہ" کافی طلبہ نے ذوق وشوق سے حصہ لیا ــــ خاص بات یہ ہے کہ کوئی استاد یا نگراں نہیں رہتا طلبہ میں استاد کی موجودگی سے ایک طرح کی جھجک پائی جاتی ہے . . . . استاد کی عدم موجودگی سے اتنا فائدہ ہوا کہ دوسروں نے اپنی بات بلا جھجک پیش کر دی ایک طرح سے یہ ایک بے تکلف مجلس تھی جس میں شرکا کسی بھی مسئلہ پر اپنی آزادانہ رائے پیش کر سکتے ہیں۔ ایسے مباحثوں سے میری نظر میں بڑا فائدہ . . . یہ ہے کہ طلبہ میں جو صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں اور جو ملکہ دبا ہوا ہے وہ اس طرح نکھرے گا، پھلے پھولے گا اور خوب سے خوب ترقی کرے گا۔

۳ر۶ر۱۳۹۷ھ آج ساڑھے آٹھ بجے صبح حضرت مولانا علی میاں مدظلہ، نے طلبہ کے ایک نئے ہاسٹل کا سنگ بنیاد رکھا اس موقعہ پر مولانا نے فرمایا کہ منشی اطہر علی صاحب کا ندوہ پر کافی احسان ہے وہ ندوہ کے بانیوں میں سے تھے اور انہوں نے اپنی زندگی ندوہ کے لئے وقف کر دی تھی۔ ان کی خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس ہاسٹل کو منشی صاحب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے چنانچہ اس ہاسٹل کا نام رواق اطہر رہے گا۔ آخر میں مولانا نے ایک پُر اثر دعا کی اور یہ محفل سنگ بنیاد اختتام کو پہونچی۔

۳ر۶ر۱۳۹۷ھ آج حضرت مولانا علی میاں صاحب امریکہ میں سکونت پذیر نوجوانوں کی تنظیم M.S.A کی دعوت پر امریکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ رفیق سفر کی حیثیت سے مولانا رابع صاحب ندوی (استاذ ادب) تشریف لے گئے ہیں۔ روس میں جو بین الاقوامی مذہبی کانفرنس منعقد ہونے جا رہی ہے اس کے داعیوں نے بھی مولانا کو اس میں اسلام کی نمائندگی کی دعوت دی ہے۔

حلقہ پیام انسانیت کے زیر انتظام ۲۰، ۲۱، ۲۲ر مئی ۱۹۷۷ء کو ندوہ کے عظیم الشان اور پُر شکوہ ہال میں ایک کل ہند کنونشن منعقد ہوا تھا۔ جس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ منجملہ ان صوبوں کے چند کے نام یہ ہیں:۔ اتر پردیش، بہار، مغربی بنگال، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، کرناٹک، مہاراشٹر۔

انتہائی گرم موسم ہونے کے باوجود نمائندوں کے علاوہ شہری حضرات کی کثیر تعداد تمام نشستوں میں حاضر رہی، اور پروگرام کو انہماک سے سُنا، ہماری توقع کے خلاف شام کی نشستوں میں ہمارا یہ وسیع اور کشادہ ہال اپنی تنگ دامنی کا شکوہ کرنے لگتا۔

کنونشن کی کامیابی سے منتظمین کے حوصلے بلند ہو گئے اور وہ اللہ تعالیٰ کی اس نصرت پر شکر گذار ہیں۔

فرنگی محل کی آخری یادگار رفیع علمائے فرنگی محل کی ثقافت ووضعداری کے آخری نشان مولانا مفتی محمد عتیق میاں صاحب فرنگی محلی ۲۷ر مئی ۱۹۷۷ء بروز جمعہ کو انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

۲۸ر مئی بروز سنیچر ندوہ کی مسجد میں جلسۂ تعزیت منعقد ہوا جس میں مولانا عبد السلام قدوائی ندوی نے مولانا مغفور کے محاسن سے طلبائے ندوہ کو واقف کرایا اور مولانا کے لئے مغفرت کی گئی۔

اس سے قبل مولانا شاہ عز الدین ندوی پھلواروی کے انتقال پُر ملال پر بھی جلسۂ تعزیت منعقد ہوا اور مرحوم کے لئے ایصال ثواب کیا گیا۔

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کی ایک عظیم تاریخی پیشکش

وفیات نمبر

یعنی

ملت اسلامیہ کی اسی صدی کی باکمال ہستیوں، اکابر ومشائخ، مشاہیر علماء وفضلاء اور اللہ کے نیک وصالح بندوں کی وفات پر الفرقان میں (۱۹۳۳ء سے ۱۹۷۷ء تک) لکھے جانے والے تعزیتی مضامین اور سوز واثر میں ڈوبی ہوئی تحریروں کا ــــ ایک جامع انتخاب جون ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آ رہا ہے۔

ضخامت: ۲۰۰ صفحات۔ قیمت: ۵ روپے۔ زر سالانہ: ۱۵ روپے

(حفاظت سے طلب کرنے کے لئے دو روپے رجسٹری فیس ارسال کرنا ضروری ہے۔)

منیجر ماہنامہ الفرقان ۳۱۔ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ